فلسفہ ہند و یونان

ہند و یونانی فلسفہ پر مشتمل تعارف، ارتقاء اور تاریخ

شفیقی عہدی پوری



❁ بسلسلہ: مشاہیرِ عالم

فلسفۂ ہند و یونان

تصنیف:

شفیقی عہدی پوری

دارالشعور

ہیڈ آفس: 32۔ میکلیگن روڈ، چوک اے جی آفس لاہور
شوروم: 42۔ مزنگ روڈ، بک سٹریٹ لاہور
042-7239138- 8460196-8435044

کتاب	⇦	فلسفہ ہند و یونان
مصنف	⇦	شفیقی عہدی پوری
اشاعت	⇦	جون 2006ء
مطبع	⇦	علی فرید پرنٹرز لاہور
برائے	⇦	ہیڈ آفس: 32۔میکلیگن روڈ، چوک اے جی آفس لاہور
دارالشعور		شوروم : 42۔ مزنگ روڈ، بک سٹریٹ لاہور
قیمت	⇦	-/120 روپے

اہتمام : محمد عباس شاد

E-mail: m_d7868@yahoo.com
Ph: 042-7239138,8435044
Mob:0300-9426395,0321-9426395

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحات
1-	حرف اول	5
2-	فلسفہ ہندو یونان	7
3-	فلسفہ جین مت	13
4-	بدھ مت اور اس کا فلسفہ	19
5-	فلسفہ نیایہ	33
6-	فلسفہ ویشسکا	36
7-	فلسفہ سانکھیا	38
8-	فلسفہ یوگ	43
9-	فلسفہ میماسہ	51
10-	فلسفہ ویدانت	54
11-	شنکراچاریہ	55
12-	رامانوج	56
13-	مذاہب ہند	60
14-	فلسفہ یونان	62
15-	سقراط	72
16-	افلاطون	75
17-	ارسطو	95
18-	ارسطو کے بعد	106
19-	افلاطونیت جدیدہ	110

حرفِ اوّل

یہ کتاب فلسفۂ ہند و یونان کا ایک مجمل جائزہ ہے جسے فقط ایک مطالعے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی تنقید و تبصرہ کی بجائے ترجمہ و تلخیص ہیں۔ گویا یہ ہر دو مذکورہ ممالک کے فلسفیانہ افکار و آراء کا ایسا خلاصہ ہے، جو فلسفے کے طالب علم کو بڑی بڑی ادق اور ضخیم کتب کے مطالعۂ عرق ریز سے بچالے گا۔ یہی نہیں بلکہ زندگی کے قیمتی ایام جو ان فلاسفہ کی کتب کے مطالعے میں صرف ہوتے ہیں وہ بھی محفوظ رہیں گے اور ان سے کوئی اور مفید کام لیا جا سکے گا۔

اگر دونوں فلسفوں (فلسفہ ہند، فلسفہ یونان) کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کے تدریجی ارتقاء سے واضح ہو جائے گا کہ فلسفے نے ہر دو مذکورہ ممالک میں قریباً ایک ہی سی منازلِ فکر طے کی ہیں اور ان کی آخری منزل بھی ایک ہی ہے جہاں پہنچ کر دونوں نے اپنا اپنا سفر ختم کر دیا ہے اور وہ منزل ہے الٰہیات جس سے ہم یہ سمجھ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہی آخری منزل ہے اور اس سے آگے عقل و فکر انسانی کی رسائی ناممکن ہے۔

اگرچہ یہ ایک مختصر کتاب ہے مگر اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑی بڑی ضخیم کتب پر بھاری ہے، کیونکہ اس میں سب کچھ موجود ہے اور ''دریا بہ حباب اندر'' کی مصداق ہے۔ افکار کا تسلسل، تدریج، ارتقاء اور نظم و ترتیب اس کی افادیت کو اور بھی یقینی کر دیتے ہیں۔

میں اپنے مکرم و محترم دوست بشیر احمد ڈار۔ ایم۔ اے مدیر معاون مجلّہ ''اقبال'' کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اس شاہراہ پر ڈالا اور فلسفے کے مطالعے کی طرف راغب کیا، میں اس سے پہلے فلسفے کے نام سے بھی بدکا کرتا تھا، مگر اب معلوم ہوا ہے کہ سلسلہ

علت و معلول اور فکر و تفکر ہی شجر علم و فضل کی شاخ بلند ہے اور اسے سمجھے بغیر عقدہ ہائے حیات کی کشود محال ہے۔

شفیقی عہدی پوری
291، شاد باغ، لاہور

فلسفہ ہند و یونان

زندگی ہر جاندار کو عزیز ہے۔ اس میں انسان و حیوان کی کوئی تمیز نہیں لیکن چونکہ انسان زندگی سے زیادہ آشنا ہے اس لئے وہ بقائے حیات کے لئے زیادہ متردد ہے بلکہ حیات دوامی کا خواہش مند ہے اور چاہتا ہے کہ ایسی زندگی حاصل کرے جسے عام حالت میں عقل کامل اور خاص حالت میں عشق کہا جاتا ہے۔ زندگی جاوید تو ناممکنات میں سے ہے، مگر یہ ممکن ہے کہ انسان کو اپنی معرفت حاصل ہو جائے اور موت کے علل سے آگاہ ہو۔ انسانی تاریخ پیدائش آدم علیہ السلام سے قیامت تک اسی کوشش و سعی میں مصروف ہے اور رہے گی کہ وہ بقائے دوام سے ہم کنار ہو جائے۔ ابھی تک یہ کوشش ناکامی سے وابستہ ہے لیکن اس سے بہت سی دیگر معلومات حاصل ہوئی ہیں، جنہیں علم و فن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، گویا مقصود اصلی تو ناپید ہے اور اس کی فروعات حاصل ہیں، جو آتش عشق کو فرو کرنے کی بجائے یا کم از کم اس کے التہاب کو مدہم کرنے کی بجائے اسے ہوا دیتی ہیں۔ اگرچہ علوم و فنون مقصود حقیقی نہیں ہیں، لیکن تفریحی و اتفاقی بھی نہیں کہے جا سکتے۔ ان سے انسان کی فقط یہی امید وابستہ ہے کہ شاید ان کے وسیلے سے محبوب کا دامن ہاتھ آ جائے۔

فلسفہ اس کے اہم وسائل میں سے ایک ہے جسے عقلاء نے اس روحانی درد کا علاج تصور کیا ہے۔ اگرچہ اس سے بھی ابھی تک کوئی اہم نتیجہ ظہور پذیر نہیں ہوا، تاہم حکماء مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں یقین ہے کہ یہ ان کے درد کا علاج بن سکے گا۔

ہر ایک فلسفی ایک خاص فلسفہ رکھتا ہے اور اپنے سلیقہ، ذوق اور معلومات کے مطابق خوشی و غم اور مرگ و زیست کی تاویل و تفسیر کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے لیے اچھا یا برا ہے، خواہ موجود ہے یا ہوگا، اس سے آگاہ ہو جائے۔ وہ سوالات ذیل کا جواب چاہتا ہے۔

انسان کیا ہے؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ انجام کیا ہوگا؟ دنیا کیا ہے؟ کیا دنیا اور

اس کی اشیاء خود بخود ظہور پذیر ہوئیں یا ان کا کوئی اور خالق ہے؟ اپنی اور دوسروں کی معرفت کیسے حاصل ہو؟ سعادت کیا ہے؟ لذت کیا ہوتی ہے؟ ہم میں خامیاں کیوں ہیں اور کیسے دور ہو سکتی ہیں؟

انسانی اعمال نیک و بد، خیر و شر، ستم و عدل انہیں سوالات بالا کے جوابات ہیں۔ انسان اپنی اندرونی تحریکات کے باعث مجبور ہے۔ انہیں سوالات کے جوابات فلسفہ کہلاتے ہیں۔

ابتدا میں فلسفے کے سوالات مختصر اور سادہ تھے لیکن مرورِ زمانہ سے مفصل اور پیچیدہ ہوتے گئے۔ ایک اصل سے اتنی فروع پیدا ہوئیں کہ طالبِ فلسفہ کے لئے ان تمام سوالات و جوابات کا حافظے میں محفوظ رکھنا ناممکن ہو گیا۔ لہٰذا وہ مجبور ہوا کہ بہت سی فروع میں سے ایک کو منتخب کر لے اور اسے سمجھنے میں عمر گزار دے۔

اگر ہم فلسفے کو وسعت مفہوم کے مطابق تقسیم کریں تو اس کے دو حصے ہوں گے۔ اول مغربی جو مغربی فلسفہ کا طریق ہے۔ دوسرا مشرقی جو ایشیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔

مشرق میں اگر فلسفہ و مذہب متحد نہ ہوں تو بھی متقارب ضرور ہوتے ہیں۔ مذہب فلسفہ بن جاتا ہے اور فلسفہ مذہب لیکن مغرب میں یہ تعلق ضروری نہیں۔

مغربی فلسفے کی بنیادیں مندرجہ ذیل ہیں:

- خالق کائنات کی تحقیق۔
- مادہ جس سے اشیاء صورت پذیر ہوئیں۔
- حقیقتِ بشر۔
- مقصودِ عقل۔
- کسی چیز کو استدلال، عقل، تجزیہ اور تجربہ سے سمجھنے کا طریق۔
- تہذیبُ الاخلاق۔
- اجتماعی زندگی اور اس کی بہترین صورت۔
- فہم و عقل۔
- حسن شناسی۔

اگرچہ مشرق میں بھی کم و بیش یہی عنوان ہیں، لیکن مشرقی فلسفی ایک مخصوص نقطۂ نظر سے بحث کرتا ہے جو آخر کار خود شناسی، خدا شناسی، پاکیزگیٔ افکار، تزکیۂ نفس و اعمال پر ختم ہوتا ہے۔ مشرقی فلسفے میں علمِ ریاضی، موسیقی، ستارہ شناسی اور طب کو اہم شمار کیا جاتا ہے اور فزکس اور سائنس کو بھی فلسفے میں شامل کیا جاتا ہے۔

ہندی فلسفی جب اپنے افکار بیان کرنا چاہتا ہے تو پہلے سلف کے افکار پیش کرتا ہے۔ ان پر تبصرہ اور تنقید کرتا ہے۔ اس طرح مجملاً دوسرے طریق بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہندی فلسفہ ذیل کے چار حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔

- پروہ پکشا یعنی افکارِ سلف۔
- کند، نا یعنی افکار سلف پر انتقاد۔
- اترا پکشا یعنی شرح افکارِ نو۔
- سدھانتا یعنی نتیجہ افکارِ نو۔

اس طرح ہندی فلسفہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔

- استیکہ۔ ویدک فلسفہ جو الہامی متصور ہوتا ہے۔
- نستیکا۔ افکار مستقل و آزاد۔

علم کی دو اقسام ہیں۔

- ایک وہ علم جو حواس پنچگانہ، اور تجزیہ و تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی مادیات کا علم۔
- وہ علم جو قیاس و استدلال سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی مجردات کا علم۔

کیا انسانی فکر بعض سوالات کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ جیسے خدا ہے؟ جان ہے؟ اگر یہ ہیں تو کیا ہیں؟ زندگی کیا ہے کہاں سے آئی ہے؟ موت کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ کیا ان سوالات کو ہر آدمی سوچ سکتا ہے اور جانتا ہے؟

اس کے جواب میں بعض مشرقی مفکرین نے کہا ہے کہ فکر ان مسائل کے حل کے لئے کافی نہیں ہے۔ لیکن بعض ایسے بزرگ پیدا ہوتے ہیں جو فوق العادت دماغ کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ بعض مشکلات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں حل کر لیتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں چاہئے کہ ہم ان کے اقوال کو صحیح اور درست سمجھیں اور ان کے نتائج کی بنیاد

پر سوچیں۔ بعض نے اس سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جوئندہ یابندہ۔ پس وسیلۂ تفکر کے یہی دو طریقے ہوئے۔ ہندوستان اور ایران اور تمام ایشیائی ممالک میں تفکر کو ریاضت، قناعت، ترک خواہشات، خدا پرستی اور سادگی سے ملا دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، مفکرین کچھ عرصہ کے بعد روحانی اور دینی ہو جاتے ہیں، لیکن مغرب میں فلسفی کا تفکر، مفکرین کے فکری حدود سے باہر نہیں جاتا اور الہام و خدا پرستی پیدا نہیں ہوتی اور جو لوگ اس سے آگاہ ہو جاتے ہیں وہ یا تو انہیں قبول کر لیتے ہیں یا انکار کر دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایشیاء میں افکار و فلسفہ اِمتدادِ زمانہ سے مذہبی ہو گئے اور بجائے خود وسعت پذیر ہو کر بھی استقلال فکر سے عاری نہ ہوئے اور اپنے کمال پر پہنچ گئے۔ لیکن یورپ میں ہر فکر صاحب فکر سے متعلق ہے اور اس کے فلسفے کے نام سے معروف ہے۔ ممکن ہے کہ ایشیاء میں کوئی فلسفی روحانی بزرگ بلکہ خدا کا مظہر ہو جائے اور اس کی گفتار بلند ہو کر الہامی ہو جائے حتیٰ کہ وہاں تک عقل کی رسائی ناممکن ہو، لیکن مغربی فلسفی مثلاً سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ میں سے کسی کو درجہ روحانی و پیغمبری حاصل نہیں ہوا۔ اسی لئے ان کے افکار کو باوجودیکہ ہم پسند کرتے ہیں الہامی نہیں کہہ سکتے۔

افکارِ فلسفہ قوم کی شائستگی اور دانش مندی کی بنیاد ہیں۔ اسی لئے جب تمام فلسفیوں کے افکار کو جمع کیا جائے تو وہ اساس دانش و فرہنگ بن جاتے ہیں۔ پس کسی قوم کی دانش مندی اس قوم کے فلسفیانہ افکار میں تلاش کرنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر فکر کی قدر و قیمت اس کے حسن و قبح پر منحصر ہے جسے عمل ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی فلسفی اپنے مصنفات کے دیباچے میں بتا دیتے تھے کہ ان کی تصنیف کا مقصد کیا ہے اور مطالعہ کرنے والے کے لیے کیوں مفید ہے۔

فلسفیانہ سوالات ہر قوم کے ماحول کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً یونانی فلسفی کے لئے یہ سوالات اہم ہیں۔ زندگی کیا ہے؟ کسی چیز کی حقیقت کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیوں ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ حسن کیا ہے؟ سعادت اور خوش بختی کیسے حاصل ہوتی ہے؟

ہندی فلسفہ، رنج کس وجہ سے ہے؟ بے چارگی کا باعث کیا ہے؟ جان ہے یا نہیں

ہے؟ قیود زندگی کہاں سے اور کیسے فراہم ہوئی ہیں؟ ان سے رہائی کس طرح ممکن ہے؟ کسی چیز کی اصل وحقیقت کیا ہے؟ کے جوابات پر محیط ہے۔

ایرانی فلسفہ، مرگ وزیست، شکست و بست، رنج و شادی، جسم و جان اوران کے آپس میں تعلق، کائنات کے نظم و بے نظمی اورانسان کے فرائض سے متعلق ہے۔

ہندو ایران میں فکر واستدلال کی بنیاد اس پر ہے کہ زندگی خواہ رنج وسختی سے پر ہو خوشی وامن وسکون سے انجام پذیر ہونی چاہئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہندی مفکر پریشانی سے ابتدا کرکے امید تک پہنچتا ہے اور ایرانی کی ابتدا پر امیدی، کشمکش اور انجام فتح مندی ہوتا ہے۔

ہندو ایران کے مفکرین تسلیم کرتے ہیں، کہ ہر بے نظمی میں ایک نظم بھی پوشیدہ ہے۔ اس نظم کو توازن کہتے ہیں سنسکرت میں یہی توازن رتہ (Rta) اور فارسی میں اشہ یا ارتہ ہے۔ وہ اسے نہایت مقدس خیال کرتے ہیں اور اپنے گیتوں میں اس کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ الٰہی قانون ہر چیز کے کمال کا راہنما ہے اوراسے عالم خیال میں مجسم دیکھتے ہیں۔ ایرانی اسے ارتہ، اشہ، ہشتہ یا سروش کہتے ہیں اور سامی اقوام جبرئیل کے نام سے یاد کرتی ہیں۔

فلسفہ میمامسہ (Mimamsa) میں ہے، کہ پجاری اور مرتاضین گناہوں سے پاک اورخوش بخت ہوکر حیات جاوید کے مالک بن جاتے ہیں۔

بودھی اور جینی فلسفہ کرم (Karma) یا عمل کا قائل ہے۔ ان کے خیال میں فقط ''کرم'' ہی انسان کوخوش بخت یا بد بخت بناتا ہے۔ چونکہ ہر عمل کی قیمت ہے اس لئے کوئی کام کرنے سے پہلے اس کی حمایت کا اندازہ کرلینا چاہئے۔

ہندی و ایرانی مفکرین کا اس پر اتفاق ہے کہ صرف معرفت انسان کو گناہوں سے پاک نہیں کرسکتی۔ عمل بھی نہایت ضروری ہے اور حیوانی نفس کو قدسی نفس کا مطیع وفرمانبردار بنانا چاہیے۔ کیونکہ نفسانی خواہشات شراروں کی طرح اچھلتی رہتی ہیں، اس لئے ہمیشہ مراقبہ اور ریاضت سے ان کی اچھل کود کا سد باب کیا جائے، کیونکہ یہ آہستہ آہستہ اپنے دھوئیں سے ذہن کو تیرہ وتار کردیتی ہیں اور دانش کو جہالت سے بدل دیتی ہے۔

اقوام قدیمہ نے ابتداء میں مظاہر قدرت خورشید، چاند، زمین، آسمان ستارے اور عناصر اربعہ کو دیکھا اوران کے متعلق سوچا۔ ان کی پرستش کی۔ وید، اوستااور افکارِ ہومر وغیرہ انہیں اشیاء سے متعلق افکار ہیں۔ ان نظموں میں ستائش مظاہر مذکورہ کے ضمن میں کبھی کبھی ایک حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے، مگر صاحب افکار حیران ہے کہ اس کی تعریف کیوں کر کرے۔

اقوام ماضی خیال کرتی تھیں کہ اگر اپنی عزیز و محبوب اشیاء کو خدا کے حضور پیش کریں تو وہ ان سے خوش ہو کر ان کے افکار و اعمال اور آرزوؤں میں مددگار ہوگا، اسی بنا پر مذہبی رسوم، عبادت، قربانی اور نیاز ایجاد ہوئیں، جو روز بروز وسیع ہوتی گئیں۔ جب وہ زمانہ آیا کہ وید کو مقدس اور الہامی تسلیم کیا گیا تو اس کی تفسیر و تاویل میں بزرگان مذہب و مفکرین کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک صرف عمل کا قائل تھا۔ جس سے مراد عبادت و رسوم دین تھیں۔ دوسرا وید کی عبارت سے افکار فلسفہ استنباط کرنے اور افکار بسیط و مجمل کو مرکب و مفصل کرنے لگا، جس سے افکار فلسفہ و اخلاق کا آغاز ہوا۔ اس مرتبہ اس کا نام "اوپانی شد" رکھا گیا۔ مرور زمانہ سے اوپانی شد کی تفسیر مرتب ہوئی اور اس سے فلسفے کے مختلف شعبے ظہور میں آئے۔

زمانہ قدیم میں نہ مطبع تھا اور نہ فن تحریر میں وسعت تھی۔ لہٰذا استاد کی باتیں حفظ کرتے تھے۔ لمبی عبارات کا اختصار کرلیا جاتا تھا۔ ایسا اختصار سنسکرت میں سوترا (Sutra) کہلاتا تھا۔ سوترا کا مطلب اختصار تھا جس کا مطلب وسیع ہو اور طلبہ کے لئے اس کا تحفظ آسان تر ہو۔

فلسفہ ہند در حقیقت فلسفہ ہنود ہے۔ جو بت پرستی سے وحدانیت تک پہنچتا ہے۔ مفکرین ہند کے افکار انواع و اقسام کے ہیں۔ ہر فکر کی بنیاد فلسفہ قدیم ہے جس میں کہیں خدا کا انکار اور کہیں اثبات ہے۔ پست ترین مذہب اور مہمل ترین فکر سے لے کر بہترین مذہب اور بلند ترین فکر تک یہاں موجود ہے۔ ہر مفکر اپنے رنگ میں مکمل رنگین ہے۔ سب کے افکار کے عمیق و وسیع مطالعے کے لئے صبر ایوبؑ اور عمر نوحؑ چاہیے۔

❊❊❊

فلسفہ جین مت

جینی فلسفے میں چوبیس ترتھنکرسوں کی تعریف کی گئی ہے۔ جینی عقیدہ کے لحاظ سے یہ کامل انسان تھے جو ہر قسم کے نقص اور بشری آلودگیوں سے پاک ہو کر خدائی کے رتبے پر فائز ہوئے اور حیاتِ جاوید پائی۔ اسی لئے جینیوں نے خدا کی پرستش کی بجائے مذکور ترتھنکرسوں کی زندگی اور کردار کے متعلق غور وفکر کیا اوران کی زندگی کو اپنا راہنما بنایا تاکہ ان کی طرح یہ بھی آلودگیوں سے پاک اور منزہ ہو جائیں۔

جینی فلسفے کی ابتدا کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوسکتا۔ کہتے ہیں، اس کا پہلا معلم رسبہ دیو (Rasabadeve) تھا لیکن رسبہ دیو کا زمانہ بھی تا حال معین نہیں ہوسکا اس کے بعد پارس ناتھ (Parsvanatha) کا نام آتا ہے جو تخمیناً قرن نہم قبل از مسیح میں زندہ تھا۔ لیکن تاریخی شخصیت جسے اگر بانی نہ کہا جائے تو مروج کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا، مہاویر وردمان ہے۔

جین ''جن'' سے مشتق ہے۔ جن کے معنی فتح مندی کے ہیں۔ جس سے ہوا و ہوس اورخواہشات پر فتح پانا مقصود ہے۔ جینی فلسفے کی بنیاد مندرجہ ذیل تین حقیقتوں پر ہے۔

- ❖ کیا ہماری دنیا حقیقت رکھتی ہے؟
- ❖ وجود کی دو قسمیں ہیں۔ جاندار (متحرک) بے جان (غیر متحرک)
- ❖ عقل جو وسائل ذیل کی مرہون منت ہے۔

(الف) حواس پنجگانہ وحس مشترک۔

(ب) عقل، قیاس واستدلال۔

(ج) دنیا کی آلائشوں سے پاک ومقدس بزرگوں کے اقوال۔

جینی فلسفے میں ہر ذی حیات کی زندگی خواہ وہ کتنا ہی حقیر وضعیف کیوں نہ ہو محترم ہے۔ فردوسی کہتا ہے۔

میازار موری کہ دانہ کش است

کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

اس لحاظ سے زندگی کی پہلی اصل بے آزاری ہوگی جسے سنسکرت میں ''اھمسہ'' کہا جاتا ہے۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گنا ہے نیست

عقل۔ جینی عقیدے کے مطابق ہوش یا معرفت ایک گوہر ہے۔ جو جان سے جدا نہیں ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں۔

روح را تاثیر آگاہی بود
ہر کرا ایں بیش اللٰی بود
اقتضائے جاں چو اے دل آگہی ست
ہر کہ آگہ تر بود جانش قوی ست
خود جہاں را جان سرابسر آگہیست
ہر کہ بے جان است از دانش تہی است

لیکن عملاً معرفت محدود ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ جینی فلسفہ اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ نفسانی خواہشوں کے حجاب چشم بصیرت کے سامنے آجاتے ہیں اور روح حقیقت کو درست طور پر نہیں دیکھ سکتی۔ اس لئے نقص، کمال اور عقل روح کی پاکیزگی اور آلودگی ہے جس کے مراتب حسب ذیل ہیں۔

ا۔ جس صورت میں کہ جان اپنی معرفت سے غافل اور خوردونوش کی طرف مائل ہے۔ یہ روح کی پست تریں حالت ہے کیونکہ روح مجبور ہو جاتی ہے کہ حواس پنجگانہ و استدلال کے وسیلے سے چیزوں کو دیکھے، جو ظن کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

۲۔ ہوا و ہوس کی قیود سے آزاد روح حقائق کو نسبتاً روشن تر دیکھ سکتی ہے۔

۳۔ معرفت کی نگاہ سے حسد، نفرت اور کینہ کے پردے اٹھ جائیں تو باطن کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔

۴۔ آلودگیوں سے پاک ہوکر روح کی روشنی دوپہر کے سورج کی طرح تابندہ ہو

کر اشیاء کو ان کی حقیقی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔

جو لوگ اس بلند مقام پر نہیں پہنچتے ہیں وہ بینائی کے لئے حواس و قیاس اور استدلال کے محتاج ہوتے ہیں۔

جینی فلسفے میں حقیقتِ یگانہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک کو گوہر (جوہر) اور دوسری کو عرض کہتے ہیں۔ ایک کو اصل اور دوسری کو فرع۔ ایک کو جان اور دوسری کو جسم۔ جوہر پائیدار اور عرض ناپائدار ہے۔ جوہر تغیر پذیر نہیں ہوتا لیکن عرض متواتر متغیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جینی نظریہ بدھیت اور ویدانت پر تنقید کرتا ہے۔ کیونکہ بودھی کہتا ہے، کہ کائنات متواتر متغیر اور فساد پذیر ہے اور کسی چیز کا ایک ہی شکل اور حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے۔

ویدانتی کا کہنا ہے کہ حقیقت تغیر پسند نہیں ۔ جسے ہم تغیر سمجھتے ہیں وہ ایک خیال ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ جینی کہتا ہے تغیر اور ثبات دونوں حقیقت ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی کہے کہ عرض ثابت ہے غلط ہے اور اگر کوئی کہے کہ جوہر متغیر ہوتا ہے تو بھی غلط ہے۔ اس لحاظ سے تغیر یا ثباتِ اشیاء بجائے خود درست ہے۔ ہر شے کی تین صورتیں ہیں۔

- جوہر یا اصل جو ثابت ہے۔
- آغاز یا حرکت۔
- تغیر۔

جوہر جان ہے جسم مسلسل متغیر ہوتا رہتا ہے لیکن جان کے لئے تغیر نہیں۔ اس جان کی خصوصیات حافظہ و شناسائی خصوصا معرفت بذات خود پائندہ ہیں۔ اگر ہم جان کی موجودگی کو نہ مانیں تو تہذیب، اخلاق، ترقی اور نجات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

جیوہ یا جان۔ ایک جوہر ہے جس کی خصوصیت تابندگی و ہوش ہے اور تابندگی و مظہریت میں جسم کے مطابق ضعف وشدت رکھتی ہے۔ مثلاً نباتات میں جان بہت کمزور ہوتی ہے، حتیٰ کہ اس کا احساس بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ جمادات میں احساس ہوتا ہی نہیں، لیکن حیوانات میں یہ احساس غالب ہے۔ جب یہ جوہر انسان کے جسم کی زینت بنتا ہے تو اور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ جان کو دوام ہے لیکن احوال و کیفیات عارضی ہوتے

ہیں۔ جان کو مکان کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مادی نہیں۔ ڈیکارٹ کہتا ہے کہ جان وجود فکری ہے اور فکر کو مکان کی احتیاج نہیں۔ لیکن جینی کا کہنا ہے کہ جان زندگی ہے یعنی جسم کو متحرک کرنے والی ہے، خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ ہیولیٰ صورت گیر اور تجزیہ پذیر ہے۔ اسی لیے اسے ثبات نہیں اور مسلسل صورتیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

تہذیب اخلاق کی بنیاد رفع نواقص بشری، تحصیل کمال اور مادی قیود سے روح کی نجات پر ہے۔ قیود مادی سے مراد یہ ہے کہ روح تناسخ کی قید سے آزاد ہو۔ درحقیقت جان بے نقص، توانا، آگاہ اور بابرکت ہے۔ نواقص محض عارضی ہیں جو بعض غفلتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور اسے مادیات کی طرف مائل کرتے ہیں اور یہ رغبت تابشِ نور کے لیے مانع ہے۔ جیسے، شبنم اور بادل کبھی کبھی اپنی کثرت اور غلاظت سے سورج کی روشنی کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ ذرات مادہ بھی جان کی رغبت کے باعث تابش نور کے لیے حجاب بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر جسم کی ساخت اس کی جان پر منحصر ہے، اگر بدن یا فکر میں کوئی نقص ہے تو خارج سے نہیں بلکہ جان کے گزشتہ تماشلسے ہے جو ابریشم کے کیڑے کی طرح اپنا قید خانہ خود بناتا ہے اور اپنے آپ کو اس میں قید کر دیتا ہے۔

جسم سے مراد صرف بدن ہی نہیں ہے بلکہ ذہن و حواس و فکر بھی ہے۔ پس انسان جو بظاہر باپ، بیٹا اور ماں ہیں، درحقیقت اپنے گزشتہ اعمال کی پیداوار ہیں۔ رنگ، قد و قامت، زشتی و زیبائی، صورت و سیرت، نقص و بے نقصی، فقر و عزت، ذات، خوش بختی، بدبختی، کوتاہی، درازی عمر، صحت، بیماری، شرافت، رذالت اور وجودِ انسانی کی دیگر جزئیات اس کے اپنے گزشتہ اعمال کی مرہون منت ہیں۔ یعنی ہر عمل انسانی زندگی کی علت ہوتا ہے۔ انواع و اعمال، کیفیات و احوال و صورت بدن کی علت ہیں۔ مثلاً کرمائے گوترہ تعین کرتا ہے، کہ اس عمل کا عامل کس خاندان میں پیدا ہو۔ آیو کرما آئندہ عمر کو معین کرتا ہے اور اسی طرح دیگر کرم ہیں جن میں سے ہر ایک مستقبل پر اثر انداز ہوتا ہے۔

بدترین نقص وہ جہالت ہے جو مادیات کے غلبے سے انسان کو اپنے متعلق پیدا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ روز بروز نفسانی خواہشات کو بڑھاتا ہے۔ اسی سے انسان میں

خشم، خودنمائی، لالچ اور حسد جیسی صفات ذمیمہ پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے ذمائم سے نجات کے لئے علم و عقل کی ضرورت ہے، جو فقط نیک اور مقدس بزرگوں کے افکار کے مطالعے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جب علم حاصل ہو جائے تو اعمال کو بھی اس کے مطابق درست کرنا ضروری ہے تا کہ انسان مادیات کی قیود سے آزادی حاصل کر سکے۔

جینی فلسفہ اخلاق میں ایمان درست، عقل صحیح اور عمل صالحہ کو زندگی کے تین گراں بہا جواہر تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ تینوں جوہر تری رتنہ کہلاتے ہیں۔

ایمان درست کا مقصد راستی کی رغبت و اعتماد ہے۔ عقل صحیح درست و نادرست میں مابہ امتیاز ہے، کیونکہ اس سے شک و گمان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عمل صالحہ سے مراد بے آزاری اور احسان ہے جس کی بنیاد ذیل کی پانچ باتوں پر استوار ہے۔

-1 اہمسہ (Ahimsa) یا بے آزاری۔ یعنی جیسا تم اپنے وجود کو عزیز و محترم سمجھتے ہو، اسی طرح دوسروں کو سمجھو۔ خواہ ظاہراً تمہیں کتنی ہی طاقت یا توانائی حاصل ہو۔ جسے آزار پہنچانے پر قدرت ہو اسے اس کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔

-2 ستیام (Satyam) یا راستی۔ غلط اور دور از حقیقت باتوں سے کلی اجتناب چاہیے۔ ہمیشہ سچ بولو۔ ایسی میٹھی باتیں کرو کہ سننے والا خوش ہو جائے۔ راست گوئی کے لیے لالچ، خوف، نفرت اور غصے کو اپنے سے دور ہی رکھنا چاہیے۔

-3 استیام (Asteyam) یا چوری سے بچنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کوئی خوشی سے دے لے لو اور جیسی کہ زندگی محترم ہے دوسروں کے مال کو بھی محترم سمجھو۔ کیونکہ مال ہی زندگی کا سرمایہ ہے۔ اسی لیے ذرا سی چوری بھی گناہ کبیرہ ہے۔

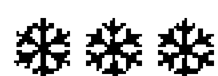
-4 برہمچاریام (Brahma Charyam) یعنی عفت و تجرد افکار و گفتار و خواہش ہائے نفسانی و شہوانی۔ یہ صرف دنیوی زندگی کے لئے ہی نہیں بلکہ دوسری زندگی میں بھی کوئی خواہش و تمنا نہیں ہونی چاہیے۔

-5 اپری گراہہ (Apari Graha) یعنی لذات مادی۔ سننے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے سے بے تعلقی، کیونکہ یہ سب آئندہ قیود مادی کی علت بن جاتی ہیں۔

ایمان درست، عقل صحیح اور عمل صالحہ اس طرح ہم آمیز ہوں کہ تینوں ایک ہو

جائیں، اگر ان میں سے ایک بھی ناقص ہوگا تو دوسری دو کو بھی ناقص کردے گا۔ اسی لیے مندرجہ بالا پانچوں باتوں کی نگہداشت نہایت ضروری ہے۔ جس نے ان کی نگہداشت کرلی اس نے تینوں رتن حاصل کر لیے۔

جینی مذہب میں خدا کا تصور نابود ہے۔ اسی لیے خدا پرستی کا وجود بھی عنقاء ہے۔ وہ نہ تو خدا سے عفو وکرم کا طالب ہے، نہ اس سے ڈرتا ہے۔ وہ فقط اعمال کو اپنا خدا مانتا ہے۔ اس کے نزدیک اعمال گزشتہ ہماری موجودہ زندگی کی بنیاد ہیں اور موجودہ زندگی کے اعمال سے مستقبل وجود پذیر ہوگا۔ اسی لیے جینی ڈر، اور احساس کمتری سے بے نیاز ہیں اور اپنی ترقی وترفع کے لیے فقط اعمال پر بھروسا کرتے ہیں۔



بدھ مت اور اس کا فلسفہ

ہندوستان کا صرف یہی ایک مذہب ہے، جس کے اثرات قریباً تمام ایشیاء کو متاثر کر گئے اور اس مذہب کے فلسفے نے بھی تمام ممالک پر اثر ڈالا۔ اسلام جیسا عظیم الشان مذہب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ درحقیقت ریاضت و نفس کشی جو ہمارے تصوف کی جان ہے، اسی مذہب کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔ بنیادی عقائد بھی اس مذہب کی دست برد سے قطعاً محفوظ نہیں رہ سکے۔ [1]

گوتم بدھ ۶۰۰ ق م کے وسط میں پیدا ہوا۔ کپل وستو کو اس کی ولادت پر ہمیشہ فخر رہے گا۔

اگر ہم اپنے گرد و پیش کو غور سے دیکھیں، تو صاف نظر آتا ہے کہ ہر چیز اپنے ماحول سے اس درجہ متاثر ہے کہ اسے اپنے ماحول ہی کی پیداوار کہنا پڑتا ہے۔ ہر جاندار کی نشو و نما اس کی ذاتی استعداد اور ماحول پر منحصر ہے۔

بچھڑے کا گھاس چرنا، مرغی کے چوزے کا انڈے سے نکلتے ہی دانہ چننا اور شیر کے بچے کا کھیل میں بھی ہر چیز پر پنجہ مارنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ طبعی اقتضاء ہے۔ برا شروع ہی میں برائی کی طرف مائل ہوتا ہے اور نیک نیکی کی طرف راغب۔

گوتم بدھ فطرتاً رحم و شفقت کا مجسمہ تھا۔ لہٰذا اس کی تعلیمات میں رحم و شفقت کی بڑی قدر ہے۔

گوتم بدھ کے خیال کے مطابق دنیاوی زندگی بچپن، جوانی، کہولت اور بڑھاپے کے ادوار سے گزرتی ہے اور موت کی منزل پر پہنچ کر ستاتی ہے۔ یہ تمام ادوار حیات درد و غم کے ایک طویل سلسلے کے ساتھ اس درجہ منسلک ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ

---

[1] بنیادی صداقتیں تمام مذاہب میں مشترک ہیں ایک صداقت جب کئی مذاہب میں قدرِ مشترک ہوتی ہے تو عام ذہن یہی سمجھتے ہیں کہ فلاں مذہب فلاں مذہب سے متاثر ہے۔ ناشر

نہیں کیا جا سکتا۔ گویا زندگی اور درد و آلام لازم و ملزوم ہیں۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(غالب)

یہی آلام و درد کامیابی، خوشی اور لذائذ مادی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی ناکامی، رنج اور بیماری میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلۂ آلام جو درحقیقت انسان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک منقطع نہ ہوگا انسانی درد و رنج بھی ختم نہیں ہو سکتے اور حقیقی خوشی ایک خیال موہوم رہے گی۔ انسانی نجات فقط اعمال پر منحصر ہے۔ اس کے لیے خواہشات نفسانی کو ترک کرنا لازم ہے تاکہ دنیا کی قیود سے رہائی حاصل ہو اور ابدی سکون و مسرت میسر آئے۔

انسان کی نجات اس کے اعمال پر منحصر ہے۔ کوئی دیوتا اور رشی اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ عجز و نیاز، عرض و نیاز اور قربانی سے عمل کا نتیجہ محو نہیں ہو سکتا۔ بہشت کی آرزو میں مصیبتیں جھیلنا اور ریاضت کی زحمتیں اٹھانا پُر درد زندگی کو اور زیادہ پُر درد بنانا ہے۔ عزت و مرتبہ اور بزرگی و ریاست کے لیے اپنی اور دوسروں کی زندگی میں آلام پیدا کرنا دوزخ آفرینی ہے۔ اس لیے آرزوئے بہشت اور آرزوئے ریاست دونوں میں کچھ فرق نہیں کیونکہ دونوں آرزوئیں ہیں۔ صرف راستوں میں فرق ہے۔ دونوں خودی پر مبنی ہیں اور جب تک خودی یا شخصیت مادی قائم ہے اضطراب و دلسوزی بھی جاری رہے گی۔ بادشاہ اپنے محلات میں زندگی گزارتا ہے۔ اسے آسائش و تن پروری کے تمام لوازمات حاصل ہیں۔ گدا زحمت و مشقت و فاقے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے لیے آسائشیں ناپید ہیں۔ تاہم شاہ و گدا میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں زندگی کے گرداب میں پڑے ہیں۔ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں جو طوفان عمل میں رواں ہے۔ دونوں زندگی کی جدوجہد میں مبتلا ہیں۔ دونوں اس گرداب حیات و بے چارگی سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ بدھ کے ایک پیرو نے بدھ اور اس کی تعلیم کے متعلق ایک افسانہ لکھا ہے جسے انگریزی ادیب ایڈن آرنلڈ نے (Light of Asia) نور ایشیاء کے نام سے

-ترجمہ کیا ہے۔ اِس میں بدھ کا ایک یوگی سے مناظرہ حسب ذیل ہے:

☆بودھ

مہاراج! آپ ریاضت سے اپنے آپ کو بہت دکھ دیتے ہیں۔ ایک عرصے سے میں بھی انہیں پہاڑوں میں زندگی بسر کر رہا ہوں، جو کچھ آپ کرتے ہیں میں بھی وہی کرتا ہوں تاکہ راہ نجات پا سکوں، لیکن اب تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکا۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ راہ نجات پا چکے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کیسے کامیاب ہوئے؟ کیا راہ نجات کم خوری، برہنگی، گوشہ نشینی اور خود آزاری سے حاصل ہوتی ہے؟ کیا زمانے کے مہیا کردہ صدمات کافی نہیں کہ ہم اور صدمات فراہم کریں اور اپنی زندگی سرتا سر رنج و غم بنالیں؟ اگر کم خوری اور فاقہ مستی سے نجات حاصل ہوتی ہے تو گھاس، ہڈیاں یا حقیر مادی چیزیں کھانے والے حیوان ہم سے زیادہ روحانیت حاصل کر سکتے ہیں، اگر ریاضت، زحمت مشقت اور غمگینی کسی کو روحانیت عطا کرتی ہے، تو بیل، گدھے اور دوسرے بار بردار جانور جو اپنے مالکوں سے بہت تکلیف پاتے ہیں۔ انہیں روحانیت میں ممتاز ہونا چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ برائی سے نیکی کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔

☆یوگی

معزز نوجوان! ہماری کتب مقدسہ میں ایسا ہی لکھا ہے کہ ہماری نفسانی خواہشات نے ہماری جان کو جسم کی قید میں ڈال رکھا ہے اور جب تک یہ خواہشیں نابود نہ ہوں گی جان اس جسم کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتی اور جب تک ان آلودگیوں سے روح پاک نہ ہو اپنے اصل سے وصال ناممکن ہے۔ اسی لیے ہم روح کی آزادی کے لیے جسمانی لذت کو ترک کیے ہوئے ہیں۔

☆بدھ

مہاراج! دیکھیے۔ بادل جو بلندی پر پرواز کرتے ہیں، جنہوں نے اپنے گوناگوں رنگوں سے آسمان کو مزین کر رکھا ہے، کبھی سورج کی چمک انہیں سنہری بنا دیتی ہے، کبھی

چاند کی کرنیں انہیں چادر سیمیں اوڑھاتی ہیں، یہ کہاں سے آئے؟ کیا یہ دریاؤں سے اٹھ کر اور قطروں میں مبدل ہو کر دریاؤں سے نہیں مل جاتے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ہر بلندی کو پستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ کیا ہر خریدی ہوئی چیز بکتی نہیں؟ آپ جسم کو بیچ کر جان خریدتے ہیں تو یہ بھی ایک خواہش ہے۔ خواہش ہی خواہش کو بڑھاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس دریا کا کوئی کنارہ نہیں۔ اس لیے جب تک خواہش باقی ہے روح آزاد نہیں ہو سکتی۔ پس یہ خون جگر سے خریدا ہوا بہشت کیسا ہے؟ اگر آپ اسے حاصل بھی کر لیں تو بھی خواہش کی موجودگی میں اسے بہشت نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اضطراب خاطر باقی رہتا ہے۔

یوگی ☆

میرے پیارے! تمہاری عقل محدود ہے۔ ہم جانتے ہوئے بھی یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ ہماری روح نے جسم سے کیسے آزادی حاصل کی! اور اب کیا ہو گا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ انسان کی اصل روح ہے اور اسی لیے معزز ہے۔ ہمیں چاہیے کہ نفس حیوانی کو جو فساد کی جڑ ہے مٹا دیں اور روح کو اس کی آلودگیوں سے نجات دیں۔

بدھ ☆

آپ کے خیال کے مطابق انسان کو فرشتہ بن کر دیوتائی صفات حاصل کرنی چاہئیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا پھر انسان کو حیات جاوید حاصل ہو جائے گی؟

یوگی ☆

حیات جاوید فقط پروردگار یگانہ کے لیے ہے۔ اس کے سوا کسی کو ابدیت حاصل نہیں۔ ہاں زندگی دراز ہو سکتی ہے۔

بدھ ☆

اس صورت میں بلند ہمت اور صاحبِ عزم صمیم کے لیے یہ بہتر نہیں کہ ریاضت اور آزارِ جسمانی کی بجائے خواہش بہشت جو خواہش کی جڑ ہے اسے فنا کر دے اور بہشت دنیا ہی میں حاصل کر لے۔ یہ جسم جس کے آپ اس قدر دشمن ہیں یہی روح کو مقصود کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ جسم تو ایک عمدہ قیام گاہ ہے۔ آپ صانع کی صنعت کو دیکھیں اور اس کی تعریف کریں۔ اس کی بخشی ہوئی نعمت کی حفاظت کریں اور جب وہ مانگے اسے

واپس کر دیں۔

یوگی ☆

ہم نے ایک راستہ معین کر لیا ہے اور اس پر چل رہے ہیں۔ دیکھیں کہاں پہنچتے ہیں، اگر تو نے صحیح راستہ پا لیا ہے تو تجھے مبارک، تو اس پر چل!

مہاتما بدھ نے اپنی بہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

خالص نیت راہ حقیقت کی راہنما ہے اور منزل مقصود پر پہنچاتی ہے۔ جو نا قابل اندازہ ہے۔ اس کا اندازہ نہ کرو۔ جس نے اس کی حقیقت پوچھی غلطی کی اور جس نے جواب دیا اس نے بھی غلطی کی۔ کتب مقدسہ میں لکھا ہے کہ ابتدا میں تاریکی تھی اور تاریکی میں عدم تھا۔ برہما نے خیال کیا اور کائنات کو پیدا کر دیا۔ بنی آدم! تمہاری نگاہ نہ تو ابتدا پر ہونی چاہیے، نہ انتہا پر، نہ اس کی جستجو کرنی چاہیے کہ نور کہاں سے آیا، کیوں کہ فانی آنکھوں سے باقی کو دیکھنا ممکن نہیں اور مادی قلب سے مادے کے بغیر تجسس بے معنیٰ ہے۔ عقل و ریاضت سے خواہ کتنے پردے آنکھوں کے سامنے اٹھ جائیں، پھر بھی حقیقت مستور ہی رہے گی، اگر دل روشن ہے تو کافی ہے کیونکہ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ وسیع فضا اجسام نورانی و تاریک سے پُر ہے اور یہ تمام ستارے اپنے اپنے فرائض میں مشغول ہیں۔

مقصود حیات، معنیٰ مرگ، حقیقت خوشی و رنج، علت و نتیجہ، مرورِ زماں اور موجودات کی آمد و رفت بلا توقف جاری ہے بالکل اسی طرح جس طرح دریا کا پانی چشمے سے نکلتا ہے اور قطرے بھی اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں، جن کی رفتار کبھی تیز اور کبھی سست ہوتی ہے۔ سب ایک بڑی سیر کے بعد دریا (سمندر) میں جا گرتے ہیں، پھر سورج کی گرمی سے بخارات بن کر اڑتے ہیں اور ابر بہار بن جاتے ہیں، پھر یہی بخارات گاتے، گنگناتے پہاڑوں اور میدانوں میں برس پڑتے ہیں۔ وہاں سے چھوٹے چھوٹے چشموں اور چشموں سے ندیوں اور ندیوں سے پھر دریا بن جاتے ہیں۔ جس راستے سے آتے ہیں اسی سے واپس چلے جاتے ہیں۔ لمحہ بھر کو سکون پذیر نہیں ہوتے۔ آسمان و زمین کے عجائب و غرائب اور انقلابات کی محرک قوت کا معلوم کرنا اتنا سمجھ لینے

کے بعد مشکل نہیں رہتا۔

شکر، تعریف اور عبادت سے تاریکی نور میں تبدیل نہیں ہوتی اور مراقبہ وسکوت سے حقیقت منکشف نہیں ہوتی، زہد و ریاضت سے اپنے جسم کو آزار مند نہ کرو کیونکہ یہ فائدے کی بجائے نقصان ہے۔ خونی قربانیوں اور نذر و نیاز سے خدا اور فرشتوں کی چاپلوسی نہ کرو کیونکہ وہ بھی تمہاری طرح بے بس ہیں۔ مذہبی ساز ونغمہ اور سرور سے اپنے دل کو خوش نہ کرو اور زھاد و مرتاضین کی طرف نہ جھکو کیونکہ ان کے پاس نجات نہیں ہے۔ چونکہ سب کچھ ہمارے اجسام سے متعلق ہے اس لیے ہمیں اپنی ذات میں نجات کی جستجو کرنی چاہیے اور اپنے آپ کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ یاد رکھو ہر شخص ابریشم کے کیڑے کی طرح اپنا قید خانہ خود بناتا ہے۔ یہ سب اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ وہ جو کچھ رکھتا ہے ماضی کے اعمال ہیں۔ ابتداء، انتہا ہے اور انتہا، ابتدا بن جاتی ہے۔ دیوتا اور فرشتے جنہیں بہشتی نعمتیں حاصل ہیں، یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں اور قعر جہنم میں پڑے ہوئے شیطان اپنے اعمال کا بدلہ پا رہے ہیں۔ یہی عمل بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بناتا ہے۔ اسی سے بلندی پستی میں، اور پستی بلندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عمل خواہ نیک ہو یا بد زمانے سے متعلق ہے جس کی انتہا نہیں۔ زمانے کے چکر کا آغاز و انجام معلوم نہیں۔ یہ بلا توقف رواں دواں ہے۔ بقائے اعمال تک یہ چکر چلتا رہے گا۔ اگر تمہارے نیک اعمال ہیں، تو آئندہ زندگی میں زیادہ نیک اور اس سے اگلی زندگی میں اس سے بھی زیادہ نیک اور اس سے اگلی زندگی میں اس سے بھی زیادہ نیک ہو جاؤ گی۔ میں نے راہِ نجات پالی ہے۔ تمہارا رنج و درد تمہارا اپنا پیدا کیا ہوا ہے۔ تمہیں زندگی اور موت کے لیے کوئی مجبور نہیں کرتا۔ تمہارے اعمال ہی سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ یاد رکھو عمل خواہش سے۔ اور خواہش رغبت سے پیدا ہوتی ہے۔ فنائے رغبت، فنائے خواہش ہے اور فنائے خواہش نابودِ عمل ہے۔ تعدیم عمل رنج و غم ہے۔

حقیقت تمام گہرائیوں سے زیادہ گہری، آسمان سے زیادہ بلند، ستاروں سے بعید اور برہما سے بہت دور ازلی وابدی ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر و بلند قوت ہے، جو ہمیشہ سے خوبی پسند ہے بلکہ وہ خود خوبی ہے۔ یہی قوت پھول کو حسین بناتی ہے، رنگا رنگ بادلوں کو جمع

کر کے سطح زمین سے بلند لے جاتی ہے اورانہیں برسا کر مردہ زمین کو زندہ کر کے اسے بہار کا لباس پہناتی ہے۔ بے جان بیج کو اگا کر درخت بناتی ہے اور اسے میٹھے پھلوں کا گہوارہ بنا دیتی ہے۔ وہ مور کو خوبصورت پر عطا کرتی ہے اور دوسرے پرندوں کو دلکش خط و خال اور رنگ ڈھنگ بخشتی ہے۔ مکھی کو اسی نے شہد بنانا اور چھتے میں محفوظ رکھنا سکھایا ہے۔ وہ جاندار کو بے جان اور بے جان کو جان بخشتی ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ ستاروں میں ہے، بجلی میں ہے، ہوا میں ہے، بارش میں ہے۔ کوئی جگہ نہیں جہاں وہ موجود نہ ہو۔ سب کچھ اسی سے ہے اور سب کچھ اسی کی طرف لوٹے گا۔ حرکت و تغیر اسی سے ہے۔ وہی عجائب و غرائب کی خالق ہے۔ ماں کی چھاتیوں میں دودھ پیدا کرتی ہے، سانپ کے منہ میں زہر بھرتی ہے، کبھی ویرانے کو گلزار اور گلزار کو ویرانہ بنا دیتی ہے۔ وہ سرو کی جڑوں میں بیٹھتی ہے اور اس کے بیج کی حفاظت کرتی ہے تاکہ اُگے، وہ کمزور سی پتی نکالتی ہے اور پھر اسے تناور درخت بنا دیتی ہے۔ محبت اور حیات کے دھاگے سے رنج و مرگ بنتی ہے۔ وہی بناتی اور مٹاتی ہے۔ دوست کے دل میں محبت پیدا کرتی ہے۔ اس کی ایسی ہی صفات ہیں جو ظاہر ہیں اور جنہیں ہم جانتے ہیں۔ اس کے سوا اس کی بے شمار ایسی صفات ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے۔ ہم اسے دیکھتے نہیں لیکن وہ تمام کاموں میں ہماری مددگار ہے۔ ہم اس کی آواز نہیں سنتے لیکن وہ گرج سے بھی بلند آواز میں باتیں کرتی ہے۔ اسے نہ کسی سے محبت ہے نہ دشمنی، نفع و نقصان کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ وہ سب کو دیکھتی ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ اعمال نیک نجات کا باعث ہیں۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گے تو وہ نہیں بخشے گی۔ وہ کسی کی طرفدار نہیں۔ ہم سے فقط فرائض کی بجا آوری کی خواہاں ہے۔ اس کے انصاف کی ترازو لٹک رہی ہے۔ جب چاہے گی اس میں ہمیں تول لے گی۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم نے جو کچھ کیا غلط کیا۔ کوئی وہاں مدد نہیں کر سکے گا۔ دروغ گو کی زبانِ اپنے دروغ سے مطلع ہوتی ہے۔ چور جانتا ہے کہ چوری کا مال حرام ہے اسے واپس کر دینا چاہیے۔ ہر وقت اس کا عدل قائم ہے اور اس سے بڑی کوئی طاقت نہیں۔ اس کا آغاز محبت اور انجام امن ہے۔ اس کی فرماں برداری لازم ہے۔

کتب مقدسہ میں لکھا ہے کہ ہم جو کچھ اب ہیں یہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے، اگر پہلے برائی کی تھی، تو اب رنج میں ہیں۔ جو کچھ ہم نے بویا تھا اسے کاٹ رہے ہیں۔ پس ہماری آئندہ سرنوشت ہمارا موجودہ عمل ہے۔ لیکن اگر ہم اس زندگی میں برے کاموں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیں اور ان کی بجائے نیکی کے بیج بوئیں اور استقامت ارادہ سے انہیں سینچیں اور غلطی و شہوت سے پاک ہو جائیں، تو مستقبل میں زندگی کی یہ محبت فنا ہو جائیگی اور اعمال کے ثمرات مہر و حقیقت بن جائیں گے اور ہماری موت ہمارے لیے زندگی ہوگی۔ گناہ قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ سکون حاصل ہوگا اور زندگی اور ہم ایک ہو جائیں گے۔ پانی کے اس قطرے کی طرح جو دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے۔

اے لوگو! اگر تم حقیقت کے متلاشی ہو تو میری سنو۔ یہ شاہراہ روشن اور ہموار ہے اور ابدی آرام کی رہنما ہے میں تمہیں چار حقیقتیں بتاتا ہوں۔

حقیقت اول ☆

رنج و غم ہے۔ یعنی یہ زندگی جو تمہیں نہایت عزیز ہے، اس کا درد و غم پائندہ اور خوشی ایک پرندہ ہے جو لحظہ بھر کے لیے ایک درخت پر بیٹھ کر اڑ جاتا ہے۔ پیدائش کی تکلیف، بچپن کی بے چارگی، جوانی کی دیوانگی کی مصیبت، عیالداری اور بڑھاپے کے رنج، بڑھاپے کی بے کسی اور آخر کار موت کی آفت، یہ ہیں ہماری کتاب زندگی کے اوراق۔ چہرۂ دلکش و قد رعنا کا عشق محبوب ہے۔ سرخ و نازک ہونٹوں کا بوسہ نہایت شیریں ہے۔ لیکن جب یہ مٹی اور کیڑوں کی خوراک بن جاتے ہیں، تو کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ اگرچہ حکومت، بزرگی اور تسلط میں بڑی لذت ہے لیکن آخر کار یہ تمام اجسام کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن کر بڑی ہی بدمزگی پیدا کرتے ہیں۔ یہ زمین خوبصورت اور خوش منظر ہے، لیکن اس کے رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ان کے باغات بے گناہوں کے خون سے سیراب ہیں۔ اگرچہ آسمان نیلا ہے، لیکن پیاسوں کے ہونٹوں کی طرح فریاد کرتا ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ نومولود جب دنیا میں آتا ہے تو روتا ہے۔

حقیقت دوم ☆

اسباب و مقصود رنج ہے۔ حواس اور خواہشات باہم مل کر آرزو کی آگ کو روشن

کرتے ہیں اور اس سے شہوت اور لالچ کے شعلے بلند ہوتے ہیں، جن کے باعث انسان موہومات سے متعلق ہو جاتا ہے اور وہم و خیال سے محبت کرنے لگتا ہے اور انہیں تمام دنیا کا مرکز خیال کرتا ہے۔ یہ غلط فہمی اسے کیفیات بلند کے مشاہدے سے روکتی اور حقیقت کی سہانی آواز سننے سے منع کرتی ہے اور انسان دعوت حق کا جواب دینے سے رک جاتا ہے۔ یہی حماقت ہے جس نے کشمکش و شہوت سے دنیا کو بھر دیا ہے اور بے شمار کمزور دلوں کو دھوکا دیا ہے اور طرح طرح کی خواہشیں پیدا کی ہیں۔ یہی غصے اور حسد کو پیدا کرتی ہے جس نے اوراق حیات خونی ہو کر رہ جاتے ہیں، یہی امن و راحت کی دنیا میں فساد کے بیج بوتی ہے جس سے گل و لالہ کی بجائے زہرناک درخت اُگتے ہیں اور پھر زہر سے ان درختوں کو ایسا سینچتی ہے کہ دفعتاً خشک ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اعمال انہیں پھر نئی مادی شکل میں متشکل کرتے ہیں اور حواس سے نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی کام علت کے بغیر نہیں ہوتا۔ ہر معلول کی ایک علت ضرور ہوتی ہے۔ ہر چیز کی پیدائش کسی نہ کسی علت کا نتیجہ ہوتی ہے اور ہر نتیجہ کسی دوسرے نتیجے کی علت بن جاتا ہے اور اسی طرح علت و معلول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تولید، عمل کا نتیجہ ہے اور بچپن تولید کا نتیجہ۔ اسی طرح جوانی بچپن کا اور بڑھاپا جوانی کا نتیجہ ہے بعینہٖ، ہر فکر اور عمل کا بھی ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ خوشی بھی غم ہی کی ایک شکل ہے اور اسی لیے اس سے دکھ اور غم پیدا ہوتے ہیں۔

صدمات حیات کا سلسلہ حسب ذیل ہے:

- علت العلل اودیہ (Avidya) یعنی جہالت۔
- سمسکار (Sumskara) مادے کی ذہنی صورتیں۔
- وی گیان (Vijanana) ابتدائے ادراک۔ یہ زندگی و اعمال ماضی کا سرمایہ ہے اور اسی سرمائے سے نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔
- نامہ روپہ (Namarupa) نام و پیکر۔
- سدآیتنہ (Sadayatana) شش گانہ وسائل یعنی پانچوں حواس اور عقل۔
- اسپرسہ (Sparsa) حواس کا محسوسات سے تعلق۔
- ودنہ (Vedana) احساس و تجربہ۔

- ترشنہ(Trshna) مادیات کی خواہش۔
- اپادنہ(Upadna) رغبت یا تعلق۔
- بھاوہ Bhava زندگی۔
- جاتی(Jati) حیاتِ نو۔
- جرامرنہ(Jara-marana) بڑھاپا اور موت۔ محبت اور عشق کے نتیجے سے زندگی حیات نو پاتی ہے۔

جب تک عمل قائم ہے یہ سلسلہ جاری ہے۔ عمل کا مطلب مادیات کی رغبت اور مادی زندگی سے محبت ہے۔ خواہ کوئی عنوان و تصور ہو جہالت ہے۔ جب تک جہالت ہے زندگی ہے اور جب تک زندگی ہے عمل لازمی ہے۔ اگر جہالت نہ ہو تو ادراک ناپید ہو جاتا ہے اور عدم ادراک سے عدم نام و پیکر وابستہ ہے اور نام و پیکر نہ ہونے سے حواس ششگانہ بھی وجود پذیر نہیں ہوتے اور حواس کے بغیر اشیاء سے محبت و رغبت ناممکن ہے۔ محبت و رغبت نہ ہونے سے اشیاء کی خواہش بھی نہیں ہوسکتی اور خواہش نہ ہونے سے احساس نہیں رہتا، اگر احساس نہ ہو تو حیات نو نہیں ملتی اور جب پیدائش ہی نہیں ہوگی بچپن، جوانی بڑھاپے اور موت کے دکھ بھی نہیں ہوں گے۔

حقیقت سوم ☆

انسداد رنج۔ اس کی یہ صورت ہے کہ زندگی بھر خواہشات پیدا ہی نہ ہوں کیونکہ ان کا اثر براہ راست قلب پر ہوتا ہے۔ اگر ان سے گلوخلاصی ہو جائے تو اندرونی ہیجان متبدل بہ سکون ہو جائے۔ ان خواہشات کو اس قدر مٹا دینا چاہیے کہ بہشت اور آسمانی سیر کی آرزو بھی باقی نہ رہے اور زندگی کا مقصد فقط فرائض کا ادا کرنا رہ جائے۔ ایامِ حیات دوسروں کی ہمدردی اور مدد میں گزاریں۔ زبان میں شیرینی ہو اور دل میں خودغرضی کا نشان تک باقی نہ رہے۔ جو اتنا کامل ہو جائے گا موت اس میں فنا ہو جائے گی اور دکھ باقی نہ رہے گا۔ اس میں زندگی اور موت جمع نہیں ہوسکیں گی کیونکہ جب شہوت کا تیل ہی باقی نہ ہوگا تو مادی زندگی کا چراغ کیونکر روشن ہو سکے گا۔ بدی اور نیکی کا حساب فیصل ہو کر میزان بن جائے گا۔ آئندہ برائی نہ ہوگی اور کشمکش تازہ کا آغاز نہ ہوگا۔

حقیقت چہارم ☆

انسدادِ رنج کا طریقہ۔ جب بیماری تشخیص ہو جائے تو اس کے علاج کی جستجو کرنی چاہیے۔ مادی زندگی کی خواہشات عزم کامل سے ختم ہوتی ہیں۔ زندگی کے دکھوں کے انسداد کا رشتہ بہت وسیع ہے۔ لیکن جس کے کان سماعت گیر اور ارادہ مضبوط ہے، اسے مندرجہ ذیل آٹھ قاعدے شاہراہ حقیقت کی طرف ضرور لے جائیں گے اور ایسے مقام پر پہنچائیں گے جو اہل جہاں کی پناہ گاہ ہے۔

طریق اول ☆

پاک عقیدہ۔ اپنے فرائض کو سمجھو۔ جب سمجھ لو تو انہیں پورا کرو۔ جو فرض نہیں اسے چھوڑ دو تاکہ اعمال میں اس کا اثر نہ رہے۔

طریق دوم ☆

پاک ارادہ۔ صرف عقل و نگاہ ہی کافی نہیں کہ علم کے مطابق عمل ہو سکے۔ اس لیے ہر ذی حیات کے بہی خواہ بنو، دشمنی اور کینہ کو فنا کر دو، لالچ اور غصے کو ختم کرو، طبیعت کو نرم بناؤ، ایسا نرم جیسے نسیم سحری ہوتی ہے کہ چلتی ہے تو سب کو تر و تازہ کر دیتی ہے۔

طریق سوم ☆

پاک گفتگو۔ زبان اور ہونٹوں کو عقل کے قبضے میں دے کر سمجھ لو کہ ہونٹ شاہی محل کے دروازے ہیں اور بادشاہ دل میں جاگزیں ہے جو پاک ہے۔ وہ جو حکم دیتا ہے، صحیح اور درست ہے۔ اس کے فرامین ہونٹوں کے دروازے سے باہر آتے ہیں۔ اس لیے ہونٹوں کو ایسا ہونا چاہیے کہ ان کی آواز سننے والا خوش ہو اور آپس کی محبت افزوں ہو کر یگانگت ترقی کرے۔

طریق چہارم ☆

پاک رفتاری۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان یا تو نیکی کرے یا برائی کو روکے۔ اعمال ایک سلکر وارید ہیں جو محبت اور ہمدردی سے گوندھی گئی ہے۔

طریق پنجم ☆

پاک روزی۔ یعنی انسان ایمانداری اور سچائی سے لوازمات حیات فراہم کرے۔

طریق ششم ☆

پاک کوشش۔ وساوس مختلفہ ہر لمحے سچائی کو اس طرح دھوکا دیتے ہیں کہ ایمان و ارادہ، سخن و رفتار اور پاک روزی کے لیے استقلال محال ہو جاتا ہے۔ لہٰذا متلاشی نجات کے لیے لازم ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اعمال و افکار کا محاسبہ کرے۔ افکار باطل سے مجتنب رہے۔ نیت کو پاک رکھے اور ایک لمحے کے لیے بھی وساوس و اوہام کے شر سے غافل نہ رہے۔ جب بھی وہ سر اٹھائیں انہیں کچل دے۔

طریق ہفتم ☆

پاک توجہ۔ توجہ اور مراقبت سے غرض حقائق کی نگہداشت ہے۔ جسم، حواس، نفس اور احوال و کیفیات اندرونی کو صحیح طور سے پہچاننا چاہیے۔ عمل میں تغیر خطرناک ہے۔ بہت سے لوگوں نے پستی، مادی اشیاء کی ناپائداری اور لذت مادی کو جانتے ہوئے بھی ٹھوکر کھائی ہے کیونکہ خواہش و شہوت ناچیز کو چیز، حقیر کو بزرگ، ناپائیدار کو پائیدار ظاہر کرتی ہیں۔ جب متلاشی نفسانی خواہشات کے چوروں کی کمین گاہ میں پہنچے، ہوش سے کام لے اور ان کے جال میں نہ پھنسے۔

طریق ہشتم ☆

پاک تصور۔ جس نے مندرجہ بالا سات طریقوں پر عمل کیا وہ آلودگیوں سے پاک ہوا۔ اسے چاہیے کہ اپنے تصور کو خواہشات سے اتنا پاک رکھے کہ کوئی آلودگی اسے آلودہ نہ کر سکے اور تدریجاً حسب ذیل چار مقامات طے کرے:

1- پہلا مقام حقیقت پژوہی کے لیے بحث و استدلال ہے۔
2- ایسے حقائق کا تفکر جن سے سرور و لذت حاصل ہو۔
3- گہرا تفکر جس سے سکون زیادہ اور سرور کم حاصل ہو۔
4- سکون و توازن کامل جسے نجات کہتے ہیں۔

چونکہ مہاتما بدھ نے مجردات کی طرف توجہ نہیں کی اور محسوسات ہی پر نگاہ رکھی ہے، اس لیے اس کی تعلیم میں الٰہیات کی بجائے اخلاق ہی ممتاز رہا ہے۔ اس کی تعلیم کا ماحصل حسب ذیل ہے:

- کرم یا عمل۔
- قانون تغیر یا ناپائداری۔
- روح۔
- نجات۔

کرم، عمل کو کہتے ہیں۔ بدھی فلسفے میں کوئی عمل غیر طبعی نہیں۔ وہ بھوک کو طبعی اور انسداد گرسنگی کو بھی طبعی کہتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص بھوکا ہو اور کھا کر معدے کو سکون دے تو اس نے کچھ نہیں کیا صرف طبیعت کا حکم مانا ہے۔ لیکن جب اس نے لذیذ اور محبوب کھانے انتخاب کر کے پیٹ بھرا تو یہ ایک عمل محسوب ہوگا۔ موجودہ زندگی گزشتہ اعمال کا سلسلہ ہے اور اسی طرح آئندہ کی زندگی موجودہ اعمال کا سلسلہ ہوگی۔ اس نقطہ فکر کا اثر یوں تو ایشیاء کے تمام مذاہب کو متاثر کرتا ہے مگر اسلامی متصوفین پر اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔ انہوں نے اسے اپنا کر اسلام میں داخل کر لیا ہے۔ محمود شبستری گلشن راز میں کہتا ہے:

جہاں کل است در ہر طرفۃ العین ❁ عدم گردد ولا یبقی زمانین
دگر بارہ شود پیدا جہانے ❁ بہر لحظہ زمین و آسمانے
بہر ساعت جوان و کہنہ پیر است ❁ بہر دم اندرو حشر و نشیر است
دو چیزے دو ساعت مے نپاید ❁ دراں لحظہ کہ مے میرد بزاید
دلے ہر لحظہ مے گردد مبدل ❁ در آخر مے شود مانند اول
جہاں خود جملہ امر اعتباریست ❁ چو آں یک نقطہ کاندر دور ساریست
برو یک نقطہ آتش بگرداں ❁ کہ بینی دائرہ از سرعت آں

بدھی روح کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ روح ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اپنی خصوصیات میں جسم سے جدا ہے۔ لیکن بدھوں کے نزدیک انسان سے مراد ایک ایسا مجموعہ ہے، جس میں اعضائے جسم، خواہ ظاہر ہوں یا باطن، فکر و ادراک، اور احساس و حواس جمع ہیں۔ ان میں سے بھی ہر ایک کسی علت کا نتیجہ ہے۔ بدھ تناسخ کا قائل نہیں کیونکہ تناسخ چکر میں روح جسم تبدیل کرتی ہے، مگر بدھ مت میں روح کی کوئی حقیقت نہیں۔ نئی زندگی سے ان کی مراد علت اعمال ہے، یعنی زندگی کا ظاہری کٹا ہوا رشتہ دوبارہ

کسی شکل میں گزشتہ زندگی کی مناسبت سے مسلسل ہو جاتا ہے۔

❄❄❄

فلسفہ نیایہ

اس فلسفے کا موسس گوتم ہے، مگر یہ گوتم بدھ نہیں بلکہ یہ ایک اور مفکر ہے جس کی تصنیف نیایہ سوترا (Nyayasutra) ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔

فلسفہ نیایہ کی بنیاد منطق و استدلال پر ہے۔ اسی لیے اس کے پیرو کے واسطے منطق کی تحصیل لازمی ہے۔

فلسفہ نیایہ کی رو سے فقط تخیل، تصور اور شاعرانہ و عارفانہ رغبت سے حقیقت روشن نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کوئی چیز ظاہری طور پر نہایت موزوں، دلکش اور حقیقت نما ہو اور اس کے شوقین بھی مل جائیں لیکن یہ اس حقیقت اور ثبوت کی دلیل نہیں ہوگی۔ اس لیے قوائے بشری کے مطابق اصول حقیقت تک پہنچنے کے لیے ذیل کے وسائل کی ضرورت ہے۔

- احساس محسوسات بہ حواس پنجگانہ۔
- قوت ممیزہ واستدلال۔
- کلمات یعنی گفتار حکماء۔
- موازنہ وتطبیق۔

محسوسات دو قسم کی ہیں۔ بعض اعضائے ظاہر سے سمجھی جاتی ہیں، یعنی آنکھ، کان وغیرہ سے بعض نفس وذہن سے تعلق رکھتی ہیں جیسے خواہش، نفرت، خوشی، دکھ درد، معرفت وغیرہ۔ قوت حافظہ، شک واشتباہ بھی وسیلہ محسوسات ہیں۔ اشتباہ غلط احساس کا موجب ہوتا ہے لیکن ممکن ہے صحیح کی طرف رہنمائی بھی کرے۔

- حد اصغر جو موضوع نتیجہ ہے۔
- حد اکبر جو محمول ہوتی ہے۔
- حد اوسط جو دونوں سے متعلق ہوتی ہے۔ منطق نیایہ کے مطابق زیادہ تر حد اکبر سے اور کم تر حد اصغر سے مربوط ہوتی ہے۔

یورپ میں منطق تین حصوں میں منقسم ہوتی ہے لیکن منطق نیایہ میں بہ ترتیب ذیل

پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔

- ❖ بیان۔ جیسے ''حامد فانی ہے۔''
- ❖ ثبوت بیان۔ جیسے ''کیونکہ حامد انسان ہے۔''
- ❖ ثابت شدہ قضیہ عمومی ''کیونکہ تمام انسان فانی ہیں۔''
- ❖ حقیقت ثابتہ کو بیان سے مربوط کرنا ''حامد بھی انسان ہے۔''
- ❖ نتیجہ و ثبوت۔ '' پس حامد بھی فانی ہے۔''

حکمائے نیایہ کے تحقیقی مسائل حسب ذیل ہیں:

- ❖ جان۔
- ❖ نفس۔
- ❖ اجسام
- ❖ حواس پنجگانہ۔
- ❖ عقل۔
- ❖ حرکت۔
- ❖ نواقص ذہن۔
- ❖ تناسخ۔
- ❖ احساس رنج و مسرت کا نتیجہ۔
- ❖ مصائب جسمانی و روحانی۔
- ❖ ہر قسم کے دکھوں سے نجات۔

فلسفہ نیایہ کے مطابق جان ایک جوہر ہے، جو نفس اور بدن سے علیحدہ ہے اور اس کی صفت عقل یا علم ہے لیکن یہ صفت عارضی و اتفاقی ہے۔ ہر شخص کو مستقل جان حاصل ہے جو نا قابل فنا ہے اور زماں و مکاں کی حدود سے آزاد ہے۔

نفس ایک جوہر لطیف ہے۔ جو جزو لا یتجزیٰ یا ذرات خود کی طرح لا یتجزیٰ اور نا قابل شکست ہے۔

نجات سے مقصود ہر قسم کے نقائص اور دکھوں سے نجات ہے اور یہ عقل کے ذریعے

اشیاء کی صحیح معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ مسرت اور اطمینان کی تعریف ہے لیکن یہ اس عقیدے کا معتقد نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے، کہ جہاں کہیں سرور ہے وہاں دکھ بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے، جیسا کہ روشنی تاریکی کے بغیر نہیں ہوتی۔ پس نجات، رنج وشادی سے نجات کا نام ہے۔

جسم یا دنیائے مادی کی تقسیم حسب ذیل ہے:

- عناصر چہارگانہ۔
- آسمان۔
- زمان۔
- مکان۔

اجسام، ذرات یا اجزائے لا تجزیٔ سے مرکب ہیں۔ بذات خود ہوش وشعور سے بے بہرہ ہیں۔

فلسفہ نیایہ میں جان، نفس، حواس اور جسم کا تعلق اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

1- جان جوہر مجرد ہے جس کی صفت عقل یا علم ہے۔ جب یہ نفس سے مربوط ہوتی ہے تو اس پر علم کی روشنی پڑتی ہے۔

2- نفس علم کے پرتو سے زندہ ہو جاتا ہے، حواس کو روشن کرتا ہے۔

3- حواس نفس کے نور سے چمکتے ہیں اور اشیاء کو روشن کرتے ہیں، اگر جان ایسے ارتباط کی محتاج نہ ہو تو عقل یا علم کی نیاز مند ضرور ہوتی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اس صورت میں یہ اتفاقی صفت اس سے چھن جائے۔ نیایہ خدا کے متعلق کہتا ہے کہ وہ علت العلل آفرینش اور نگہبان ہے۔ وہی اشیاء کا نابود کرنے والا ہے، لیکن کسی چیز کو نیستی سے ہستی میں نہیں لاتا بلکہ موجودات بے نظم وصورت کو منتظم کر کے صورت دیتا ہے۔

❋❋❋

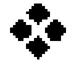
فلسفہ ویشسکا (VAISHESIKA)

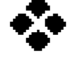
بعض لوگ فلسفہ ویشسکا کو نیایہ کا حصہ سمجھتے ہیں لیکن یہ دونوں فلسفے جدا جدا ہیں۔ اس فلسفے کی شرح الوکا ملقب بہ کنادا (Kanada) نے وشیسکا سوترا نامی کتاب میں کی ہے۔ مذکورہ کتاب دس جلدوں میں ختم ہوتی ہے۔ کئی اور لوگوں نے بھی اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ فلسفہ نیایہ اور ویشسکا متفق ہیں کہ انسان کے مصائب ونواقص کی بنیاد جہالت پر ہے اور کامیابی جہالت سے بچنے میں ہے۔ ان دونوں فلسفوں میں امتیاز یہ ہے کہ نیایہ میں عقل کے وسائل چار ہیں اور ویشسکا میں صرف دو یعنی ادراک و استدلال۔ پہلا حواس پنجگانہ کے ذریعے سے اور دوسرا قوت ممیزہ کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے۔ نیایہ میں ۱۶ عنوان زیر بحث لائے گئے ہیں مگر ویشسکا میں صرف نو پر اکتفا کیا گیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

☆ جوہر

جو بذات خود مستقل ہے اور اس میں صفت یا عرض اور کرم یعنی فعل مضمر ہوتے ہیں۔ اگر جوہر نہ ہو تو عرض وفعل بھی نہیں ہوتے۔ جوہر عرض وفعل کا نیازمند نہیں ہے۔ جوہر نو قسم کے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

- خاک۔
- آب۔
- روشنی۔
- آسمان۔
- ہوا۔
- زمان۔
- مکان۔

 جان۔

 نفس۔

❄❄❄

فلسفہ سانکھیہ (SANKHYA)

یہ کپیلا نامی مفکر کا نتیجہ فکر ہے۔ اس کی تصنیف کا نام تت و سماسو (Tativasmasu) ہے۔ چونکہ یہ کتاب بہت مختصر اور دقیق تھی اس لئے کپیلا نے خود اس کی شرح لکھی۔ اس کے بعد اس کے شاگرد آسوری (Asuri) اور آسوری کے شاگرد پنکا سیکھا (Panca-sikha) نے اس کی شرح لکھی۔

اس فلسفہ کی بنیاد دو حقیقتوں پر ہے۔

- روح یا پروشہ (Parusha)
- پراکرتی (Parkirita) یعنی وہ قوت جو عالم مادیات کی علت العلل ہے۔

سانکھیہ معلوم کو علت سے جدا نہیں جانتا۔ اس نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ نتیجہ میں کہتا ہے کہ علت معلول کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے علل و معلول بہت ہیں۔ جہاں یہ سلسلہ منتہی ہوتا ہے وہاں ایک علت العلل صورت اور جسمانیت سے نکل کر محض قوت بن جاتی ہے، جسے پراکرتی کہتے ہیں۔ علل و معلول یا جواہر و اعراض کا سلسلہ پراکرتی اور عالم مادیات سے وابستہ ہے۔ روح نہ علت ہے نہ معلول۔ محض علم ہے جو پراکرتی کے ساتھ متعلق ہے۔ روح کا یہ ارتباط پراکرتی کی فضائے تاریک و بے شعور کو نور علم سے منور کرتا ہے اور پراکرتی میں حرکت پیدا ہوتی ہے اس حرکت کا نتیجہ تولید اشیاء اور ظہور کائنات ہے۔ علت معلول سے زیادہ لطیف اور معلول پر محیط ہے۔ مولانا رومی بھی اس کے ہمنوا ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

تنگ تر آمد خیالات از عدم

زاں سبب باشد خیال اسباب غم
باز ہستی تنگ تر بود از خیال
زاں شود روئے قمر ہم چو ہلال
باز ہستی جہان حسن و رنگ
تنگ تر آمد کہ زندانے بست تنگ

معلول علت سے پیدا ہو کر پھر علت میں گم ہو جاتا ہے۔

صورت از بے صورتی آمد برون
بازشد کانا الیہ راجعون

جس طرح لطافت کثافت سے مبدل ہوئی تدریجاً کثافت سے لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اسی طرح دنیا متغیر ہوتی ہے تو اجسام عناصر پیدا ہو جاتے ہیں، عناصر جواہر بنتے ہیں اور جواہر قوت اور قوت پراکرتی بن جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ روح ذات ہے اور اگرچہ مادی تغیرات سے متعلق ہے، لیکن درحقیقت جداگانہ ہے اور تغیرات مادی سے مطلق متاثر نہیں ہوتی۔

پراکرتی میں تین قوتیں باصفات ہیں جو پراکرتی سے جدا نہیں بلکہ اس کے تین رخ ہیں جس طرح کہ علم روح سے جدا نہیں ہے۔

- ستوہ (Sattva)
- رجس (Rajas)
- تمس (Tamas)

ان کی اصل محسوس نہیں ہوتی لیکن طبائع اور صور کی رنگا رنگی استدلال سے ثابت ہو سکتی ہے اور ان میں سے ہر ایک مستقیماً یا غیر مستقیماً دوسری صفت کی علت ہوتی ہے۔

ستوہ ☆

جب کسی جسم میں ظاہر ہوتی ہے تو اسے مسرت اور روشنی دیتی ہے تابندگی اس کا نشان ہے اور تابش حقیقت ہر چیز کو ظاہر کر دیتی ہے۔ کسی چیز کا ظاہر ہونا اس کا علم ہے۔ اگر ستوہ نفس پر جلوہ افگن ہو تو نفس کو روشن کر دیتی ہے اور نفس اس روشنی کو حواس پر منعکس کرتا ہے اور حواس اشیاء کو منور کر کے اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ روح انہیں دیکھ لیتی ہے۔ روح کی دید ان کا علم ہے۔

رجس ☆

ایک قوت ہے جو اشیاء کو متحرک کرتی ہے۔ اسی سے تمام چیزیں متحرک ہوتی ہیں۔ اگر آگ میں شعلے پیدا ہوں یا زور کی آندھی چلے تو اس قوت کا اثر ہوگا۔ اسی طرح اضطراب و حرکت اور انسان کی فعالیت اسی سے ہے۔ زحمت، مشقت، جہدیت اور فکر بھی رجس ہی سے متعلق ہیں۔

تمس ☆

جمود و خمود ہے۔ ستوہ سبک اور تمس سنگین ہے۔ ستوہ روشن اور تمس تیرہ ہے۔ اگر یہ نفس پر غالب آجائے تو نفس کو بھی تاریک و متحیر کر دیتی ہے اور عقل پر جہالت کا پردہ ڈال کر غفلت اور پریشانی کا موجب ہوتی ہے۔ خواب، تن پروری، سستی، بے اعتنائی، بے خبری اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔

ان تینوں عناصر کو تین رنگوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی ستوہ سفید، رجس سرخ ہے اور تمس سیاہ۔ تینوں رنگ اور تینوں عناصر ایک ساتھ رہتے ہیں اور ان کی جدائی ناممکن ہے۔ البتہ کبھی ایک زیادہ اور دوسرا کم ہو جاتا ہے۔ اگر ستوہ، رجس اور تمس پر غالب آجائے تو انسان نیک اور عاقل ہو جاتا ہے اور اگر رجس غالب آجائے تو تہور اور شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ اگر تمس کو برتری حاصل ہو تو جہالت، تن پروری اور پست ہمتی سے ہم

آغوشی ہوتی ہے۔ تینوں قوتیں ایک ساتھ رہتی ہیں اور متواتر ایک، دوسری دو کو چھپائے رہتی ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے تیل، بتی اور روشنی کہ تینوں ایک دوسرے سے جدا اور لازم وملزوم ہیں اور جب تک تینوں نہ ہوں روشنی ناممکن ہے۔ یہ ہر شخص بلکہ ہر چیز میں موجود ہوتی ہیں اور دریا کی لہروں کی طرح کبھی ایک نیچے چلی جاتی ہے اور دوسری دو ابھر کر بلند ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی حرکت، بلندی اور پستی انہیں سے ہے۔ فلاسفہ سانکھیہ روح کو خودی یا ذات کہتے ہیں۔ یہی ہر جاندار کی حقیقت ہے اور پراکرتی سے جدا ہے۔ حقیقی ہے، مستقل ہے۔ ازلی وابدی ہے۔ اس کی صفت علم ہے جو روح عالم ہے۔ اس لیے علم کی صفت اس سے جدا نہیں ہے بلکہ روح وعلم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ رومی کہتے ہیں۔

چوں سر و ماہیت جاں مخبر است
ہر کہ او آگاہ تر با جاں تر است
اقتضائے دل چو اے دل آگہیست
ہر کہ آگہ تر بود جانش قوی است

روح فعالیت نہیں رکھتی، معلول نہیں بنتی اور نہ مستقلاً کسی چیز کی علت ہے۔ یہ محیط ہے اور کسی سے متعلق نہیں۔ نہ یہ کسی سے متاثر ہوتی ہے۔ ارواح بہت ہیں اور ہر ایک کسی نہ کسی جسم پر محیط ہے۔ زندگی روح سے ہے۔ روح نہ تو فعال ہے نہ پراکرتی۔ اس لئے کہ پراکرتی علم سے محروم ہے۔ لیکن جب روح اور پراکرتی ملتی ہیں تو ایک مثبت ہوتی ہے اور دوسری منفی، دونوں کا اعتدال ایک نئی صورت پیدا کرتا ہے۔ پراکرتی کے تینوں عناصر میں سے پہلے رجس متحرک ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے باقی دو بھی متحرک ہو جاتے ہیں اور ان تینوں کے تحرک سے سخت اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ ہر ایک دوسرے دو پر غالب آنا چاہتا ہے۔ کبھی ایک غالب آتا ہے اور دوسرا کمزور ہو جاتا ہے۔ جب تک روح کا پرتو پراکرتی پر باقی ہے، یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

فلسفہ سانکھیہ خدا کا معتقد نہیں ہے۔ متاخرین سانکھیہ میں سے بعض نے کہا ہے،

کہ اگرچہ خدا خالق نہیں ہے لیکن مخلوقات کا محافظ ضرور ہے۔ خدا کی طرف توجہ نہ ہونے کا باعث یہ ہے کہ سانکھیائی روح کو حقیقی، ابدی اور آلودگیوں سے پاک ومنزہ مانتے ہیں۔

کائنات کی علت پراکرتی ہے۔ جو مطلق بے شعور ہے اور اسی لئے مادی زندگی کی علت ہے۔ اگرچہ روح اور پراکرتی جدا جدا ہیں، لیکن سانکھیائی مفکرین کے نزدیک روح اپنے حسن کو پراکرتی کے آئینہ میں دیکھ کر ایسی عاشق ہوئی ہے کہ حیران ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی یہ حیرت مادی زندگی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

❄❄❄

فلسفہ یوگ

یہ فلسفہ سانکھیائی فلسفہ کا تتمہ ہے، یعنی سانکھیائی نظریے کو عملی کرتا ہے۔ اس کا بانی پتنجلی ہے۔ جس کی پہلی تصنیف یوگ سوتر (Yogasutra) ہے جسے پتنجلی سوتر بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد اسی فلسفہ کے متعلق اور کتابیں بھی لکھی گئیں۔ یہ فلسفہ اس قدر مقبول ہوا کہ ہندوستان کے تمام مذاہب اور بیرون ہند کے مذاہب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

فلسفہ سانکھیا میں پروشہ اور پراکرتی دو مستقل حقیقتیں ہیں اور دونوں ازلی اور ابدی ہیں۔ گو آپس میں ہم شکل و ہم جنس نہیں لیکن ایک دوسری سے قریب تر رہتی ہیں۔ بینھما برزخ لا یبغیان والا معاملہ ہے۔ ان کا آپس میں قرب کائنات اور مادی زندگی ہے اور جدائی مطلق قیامت۔

فلسفہ سانکھیا کے مطابق روح تمام قیود اور مادی نقائص سے آزاد اور پاک ہے۔ فلسفہ یوگ نظریوں سے گزر کر اسے عملی بنانے کے لیے ساعی ہے۔ اس بنا پر فلسفہ سانکھیا اور یوگ ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ ایک نظری ہے اور دوسرا عملی۔ یوگ میں ایک چیز کی زیادتی ہے یعنی خدا کا عقیدہ۔

سانکھیا اور یوگ دونوں فلسفوں کی نگاہ میں جان حقیقی ہے، پاک و آزاد ہے، بے نقص ہے۔ جس نے عقل، نفس اور حواس کے ذریعے جسم سے اتصال پیدا کیا ہے اور اس اتصال کے باعث وقتی طور پر اپنی خصوصیات سے دست بردار ہے۔ عقل، پراکرتی کی پہلی معلول ہے، جس پر عنصر ''ستوہ'' محیط ہے۔ چونکہ ستوہ کی صفت پاکیزگی اور روشنی ہے لہٰذا عقل بھی آئینے کی مانند صاف اور روشن ہے۔ عقل کی مادی روشنی جان کی روشنی سے

جدا ہے۔ چونکہ عقل پراکرتی سے وابستہ ہے۔ اس لیے علم سے بے بہرہ ہے، لیکن جان کی حقیقی قرابتدار ہے اس لیے نور علم سے منور ہوگئی ہے اور عالم وعلم نما ہے۔

اگر چہ جان تغیر پذیر نہیں ہے اور غیر متحرک ہے، لیکن مختلف صورتوں میں جو عقل کے آئینے سے متصل ہوتی ہیں، گزرتی ہے اور منعکس ہو کر متحرک نظر آتی ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو زیادہ روشن دیکھنا چاہیں، تو کہنا چاہیئے کہ جان ایک چاند ہے جو آب رواں میں منعکس ہو کر تیزی سے متحرک معلوم ہوتا ہے، یا جیسا کہ لطیف بادلوں میں متحرک دکھائی دیتا ہے۔

جو تغیرات عقل میں ظاہر ہوتے ہیں، ہم انہیں احوال قلب یا ذہنی کیفیات کہتے ہیں اور یہ مختلف اور بے شمار ہیں۔ انہیں توضیح و اختصار کے پیش نظر فلسفہ یوگ میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔

- پرمانہ (Parmana) اشیا کی صحیح شناخت۔
- وپریایہ (Viparyaya) اشیا کی غلط شناخت۔
- وی کلپہ (Vikalpa) تصور و خیال۔
- ندرہ (Nidra) غفلت و غنودگی کی کیفیات۔
- سمرتی (Smirti) حافظے کا محفوظہ۔

حواس پنجگانہ کی وساطت سے شناخت (اس صورت میں کہ سب درست ہوں) عقل، استدلال، تجربہ اور عقلائے سلف کی شہادتیں حاصل ہوں۔

وپریایہ☆

اشتباہات ہیں جو راست نما ہوتے ہیں اور تحقیق و تدقیق کے بعد درست ثابت ہوتے ہیں۔ خواب میں تمس کا عنصر نفس پر غالب ہوتا ہے اور انسان بہت کچھ دیکھتا ہے۔ سمرتی سے مقصد معرفت کا ذخیرہ ہے جو ذہن میں نقش ہو جاتا ہے اور جب توجہ کریں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ کیفیات بلا توقف آنکھوں کے سامنے گزرتی رہتی ہیں۔ جان انہیں عقل کی تختی پر دیکھ کر اپنے آپ کو متحرک خیال کرتی ہے اور اسے اشتباہ ہوتا ہے کہ آغاز ہوا اور

ماں کے پیٹ سے تولد ہوئی، اب بچہ ہے، اب جوان ہوگئی اور آخر کار مرگئی۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ نہ اس کا آغاز ہے نہ انجام۔ فلسفہ یوگ بتاتا ہے کہ اس مغالطہ سے کیونکر بچیں؟ اس کی تین اصلیں ضروری مانی گئیں ہیں۔

پہلی اصل☆

جسم کی صحت و توانائی۔ کیونکہ صحیح روح صحیح جسم میں ہی ہوتی ہے اور جب تک بدن کے اعضاء صحیح طور پر کام نہ کریں، صحیح فکر کام نہیں کرتا اور جب فکر درست نہیں ہوگا، صحیح حقائق پیدا نہیں ہوں گے لہٰذا علم، ناقص اور فکر باطل رہے گا۔ پس عقل صحیح کی تحصیل کے لیے جسم صحیح لازمی ہے۔ بیمار اور ناقص جسم نہ تو دنیا کے کام کا ہوتا ہے، نہ فکر کی مدد کرتا ہے۔ بدنی صحت تین وسائل سے حاصل ہوتی ہے۔

وسیلہ اول☆

فکر و ذہن کی صحت ہے۔ محقق کو ہمیشہ فکر صحیح کے لیے بے ہودہ اور بے نتیجہ افکار سے پرہیز کرنا چاہیے۔

وسیلہ دوم☆

ورزش ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ایک عادت ہے جو اعصاب، دوران خون اور اعضائے رئیسہ کی تقویت کا سبب بنتی ہے۔ دوسری معنوی ہے جو فلسفہ یوگ سکھاتا ہے۔

وسیلہ سوم☆

صحیح خوراک ہے جو صحت بخش ہو اور اتنی کھائی جائے جو ذہن کو منور اور جسم کی توانائی کو بحال رکھے اور بار خاطر نہ بنے۔

عادی ورزش سے اعصاب اور اعضائے رئیسہ قوی ہوتے ہیں، دوران خون

درست ہوتا ہے، لیکن یوگ کی ورزش میں اعضاء، نفس کے اختیار میں ہو جاتے ہیں۔ نفس ان کا تابع نہیں ہوتا۔ مشہور ہے کہ مرتاضین فوق العادۃ کام کرتے ہیں۔ ان کے متعلق جو کچھ سنا جاتا ہے، اگر اسے مان لیں تو کہنا پڑتا ہے اعضائے جسم، بلکہ چاروں عناصر اور حواس مکمل طور پر ان کے زیر فرمان ہوتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ایک یوگی کئی کئی گھنٹے کے بعد دم لیتا ہے، کئی دن تک بے کھائے ہی زندہ رہ سکتا ہے، ہوا میں اڑتا ہے، گھنٹوں تک اس کا دل حرکت نہیں کرتا، وہ زندہ دفن ہو جاتا ہے، لوگوں کے دلوں کی باتیں جان لیتا ہے، اسے کہیں آنے جانے میں مطلق رکاوٹ نہیں ہوتی، یعنی دیواریں، پہاڑ، سمندر اسکے راستے میں حائل نہیں ہوتے۔ مختصر یہ کہ فوق الفطرت کام کرتا ہے۔ عمر کو بڑھالیتا ہے بلکہ جب چاہے مرتا ہے۔ اگر نہ چاہے تو زندہ رہتا ہے۔ اگرچہ اس میں مبالغہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یوگی کی زندگی عادی زندگی کے خلاف ہے اور یقینی طور پر عادی زندگی سے بہتر ہے۔ وہ جسمانی صحت کو قائم رکھتا ہے، ذہن کو روشن کرتا ہے۔ بینائی تیز ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت خوش وخرم رہتا ہے اور ڈر یا خوف اور پریشانی اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا، جھوٹ نہیں بولتا، کھانے کے لئے زیادہ محتاج نہیں، کسی کو دکھ نہیں دیتا، وہ بے غم ہوتا ہے، حیوانی خوشی سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ دیانت وامانت کا پتلا اور شفیق ومہربان ہوتا ہے۔ جو شخص ان صفات کو ورزش روحانی میں دیکھنا چاہے، اسے چاہیے کہ ورزش جسمانی کو روحانی کے ساتھ ملا دے۔

اصل دوم ☆

تفکر وتوجہ اور مراقبہ ہے۔ یہاں پہنچ کر خدا کا عقیدہ لازمی ہو جاتا ہے، کیونکہ توجہ کا مرکز ایسی ذات یا نقطہ ہونا چاہیے، جو نہایت لطیف، کامل اور بے نقص ہو، فکر کی ورزش کے لیے کامل راہنما ضروری ہے۔ مراقب کا ارادہ پاک اور مضبوط ہونا چاہیے۔ وہ مستقل مزاج ہوتا کہ یک سوئی میں کامل ہو جائے اور اس کے ذہن میں بے شمار روپوں کی بے شمار صورتوں کی بجائے خدا کی صورت جلوہ گر ہو۔ وہ اسے تنہا دیکھے اور اس سے مسرت حاصل

کرے۔ مرکز فکر و تصور فلسفہ یوگ ہے۔ اس کے بغیر کوئی محقق یوگی نہیں بن سکتا۔

اصل سوم ☆

یہ پہلی دو اصلوں کی تفصیل ہے اس کی ترتیب اس طرح ہے:

یام (Yama) تحمل و برداشت اور ان کے متعلقات

(الف) اہمسہ یعنی بے آزاری، ارادہ، گفتگو اور رفتار و کردار میں۔

(ب) ستیہ (Satya) سچائی۔ یعنی ہر کام میں سچائی اختیار کی جائے حتیٰ کہ خیالات بھی راستی سے نہ بھٹکیں۔

(ج) استیہ (Asteya) چوری سے اجتناب ہو یعنی کسی کو اس کے جائز حق سے محروم نہ کیا جائے۔

(د) برہما چاریہ (Brahma Charaya) کسی سے بخشش قبول نہ کی جائے۔ کیونکہ بخشش قبول کرنا گدائی یا رشوت ہے۔

نیام (Niyama) جسم کی صفائی اور پاکیزگی ☆

اس سے ظاہری اور باطنی صفائی مراد ہے۔ جسم کو ہمیشہ نہا دھو کر پاک و صاف رکھا جائے تاکہ اس کی غلاظت سے جسم کے باطنی اعضا ناقص و فاسد نہ ہو جائیں۔ سادہ غذائیں کھائی جائیں۔ یہ بھی اتنی مقدار میں ہوں کہ ''خوردن برائے زیستن'' کے مصداق ہو۔ ذہن کو پاک رکھا جائے۔ باطل، بے ہودہ، بے نتیجہ اور خشم آور افکار کو ذہن سے دور رکھا جائے۔ گفتگو میں تبسم و بشاشت ہو۔ زود رنجی کو چھوڑ دیا جائے۔ سب کے ساتھ دوستی، شفقت، ہمدردی اور مہربانی کا سلوک کیا جائے۔ کدورت اور نفرت کو قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے۔ اپنے آپ کو گرمی اور سردی کی برداشت کے قابل بنایا جائے۔ تن پروری اور آرام طلبی سے اجتناب ہو۔ فرصت کے اوقات مطالعہ کتب مفید، تجربات نو میں گزارے جائیں۔ مشیت ایزدی کو تسلیم کیا جائے۔ صبر اور شکیبائی کو اپنایا جائے۔

اضطراب، پریشانی اور سرکشی سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

آسن (Asana) یعنی نشست ☆

فلسفہ یوگ میں طریق نشست یا آسن کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کے لیے مخصوص نشست معین ہے۔ آسن ایسی نشست ہے جس میں دوران خون میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور اعضائے رئیسہ کو ایسا سکون میسر آتا ہے کہ وہ صحیح طور پر کام کر سکتے ہیں۔ کتب یوگ میں نشست کا طریق تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ہر قسم میں صحت جسم اور قوائے فکریہ کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے۔ صحیح نشست صرف مطالعہ کتب سے نہیں آ سکتی بلکہ اس کے لیے کامل استادِ کی ضرورت ہے۔ اس نشست سے انسان بہت سے امراض سے محفوظ رہتا ہے اور درست سانس لے سکتا ہے اور دل جمعی سے ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے۔

پرانایام (Pranayam) یعنی طریق دم کشی ☆

اس کے لئے بھی ماہر استاد کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ سانس کھینچنا اور چھوڑنا سکھائے۔ شیخ سعدی کہتے ہیں "ہر نفس کہ فرو مے رود ممد حیات است و چوں ہر مے آید مفرح ذات۔"

دم کشی متصوفہ اسلام میں بھی مروج ہے۔ یہ یوگ کی سخت ترین ورزش ہے۔ اگر کوئی استاد کے بغیر کرے تو نفع کی بجائے نقصان ہوتا ہے، حتیٰ کہ دماغی خشکی اور دیوانگی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ مقررہ وقت پر پاک اور ہوادار جگہ پر جب کہ معدہ بھرا ہوا نہ ہو، ناک کے ایک سوراخ سے لمبی سانس کھینچ کر سینہ میں جمع کرے اور ناک کے دوسرے سوراخ سے آہستہ آہستہ سانس چھوڑے۔ جب اس ورزش میں کمال حاصل ہو جائے، تو مراقبہ شروع کرے اور اپنے خیالات کو ایک مرکز پر جمع کرے۔ قسم قسم کی اشکال کی بجائے ایک معین صورت کا تصور کرے تو نفس کا اضطراب مبدل بہ سکون ہو جاتا ہے، ذہن روشن ہو جاتا ہے۔ بعض یوگی عرصہ دراز تک سانس روک سکتے ہیں اور جب تک

سانس نہ لیں ان کا تصور ایک معین نقطہ پر مرکوز رہتا ہے۔

پرتی ہار (Partyahara) یعنی حواس پنجگانہ پر تسلط اور ان کا ماتحت ہونے کی بجائے انہیں اپنے تابع کرنا☆

جب کوئی شخص اس ورزش میں کامل ہو جاتا ہے، اس کا نفس کسی بیرونی حسن و آواز اور نفسانی خواہشات سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہ ورزش بھی بڑی سخت ہے اور استقامت کامل اور زمانہ دراز چاہتی ہے۔

دھارن (Dharana) یعنی مشق ذہن☆

ابتدا میں ایک نقطہ معین کیا جاتا ہے اور اس پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے خواہ دونوں ابروؤں کے درمیان یا ناف یا کسی اور مقام پر، جب نگاہ مرکز کی عادی ہو جاتی ہے تو تصور باطن میں مشغول ہو جاتی ہے اور اپنی مقصودی شکل کو باطنی نگاہوں میں پاتی ہے اور اس میں محو ہو جاتی ہے۔ جب کامل ہو جاتی ہے، تو مطلوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اس کے دیدار اور وصال سے کامیاب ہوتی ہے اور اس بلند مقام پر قائم رہتی ہے۔

دھیان (Dhiana) یعنی مراقبہ☆

دھیان میں بھی وہی تصور ہوتا ہے۔ جس کا ذکر دھارن میں گزر چکا ہے۔

سمادھی (Samadhi) یہ تصور کا اعلیٰ ترین مقام ہے☆

اس مقام پر جو پہنچ جاتا ہے وہ ما سوا حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے اور خدا میں محو و مستغرق ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص عادی نہیں بلکہ مافوق البشر ہو کر صفات ملائکہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ مقام خاص خاص اشخاص کا ہے۔ ہر ایک کو میسر نہیں ہوتا۔

فلسفہ یوگ کا نصب العین تمرکز و تصور ہے۔ جب تک کوئی اس مقام پر نہیں پہنچتا حقیقت سے

بے خبر رہتا ہے۔

❄❄❄

فلسفہ میماسہ (Mimasa)

اس فلسفہ کا بانی جے منی مفکر تھا۔ اگرچہ یہ بھی ہندی مذاہب فلسفہ میں سے ایک فلسفہ شمار ہوتا ہے، لیکن دراصل علم الکلام ہے، کیونکہ اس فلسفہ کے مصنفوں کا مقصد وید کی حقانیت اور عظمت ثابت کرنا ہے۔ ان کے نزدیک وید قدیم اور ازلی و ابدی ہیں۔ ویدوں کا مصنف انسان تو ایک طرف خدا بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود بخود وجود پذیر ہوئیں اور چند پاک مفکروں کی زبان پر جاری ہو گئیں۔ وید کے صفحات کو الوہیت کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ جو کچھ ان میں ہے ان پر بے چوں و چرا عمل کرنا چاہیے۔ وید کے گیت زمانہ وید کے دیوتا اندر، مترہ، ورونہ، اشون اور اگنی وغیرہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔ یہ یا تو مظاہر فطرت تھے یا آسمانی ستارے۔

فلاسفہ میماسہ نے وید کی تقدیس اور الوہیت میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ مذکورہ دیوتا بھی ماند ہو کر رہ گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ جتنی مقدس اور اہم ان کی عبارات ہیں، دیوتا بھی اتنی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ شعرا جنہوں نے وید کے نغمات لکھے اور انہیں گایا، وہ اس کے ناظم نہیں بلکہ مروج ہیں کیونکہ انسان کا قول چاہے وہ کتنا ہی عقل مند کیوں نہ ہو، نقص سے پاک نہیں ہوتا اور وید نقص سے پاک قدیمی اور ازلی و کامل ہیں۔ اگر ان میں اشتباہ ہو تو یہ عقل کا اشتباہ و نقص ہوگا، نہ کہ وید ہوگا۔

اگر فطرتی استعداد اور حواس درست کام کریں، تو جو کچھ محسوس ہوگا درست ہوگا۔ اس لیے مفکرین سلف کے تجربات اور نتائج بھی درست ہیں اور سب سے بڑھ کر درست و راست احکام وید ہیں۔ ہمیں ان کے مطابق مذہبی رسوم ادا کرنی چاہئیں۔ قربانی اور نیاز دینی چاہیے اور جن باتوں سے وید کے احکام منع کرتے ہیں، ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر ہم وید کے مطابق مذہبی رسوم بجا لائیں تو آسمانی برکت اور بہشت جاوید ملے

گا۔ وید کا علم روح اور جسم کے اتصال کا پابند رہے گا اور جب روح جسم سے جدا ہوگئی تو علم کی محتاج نہیں ہوگی، کیونکہ روح کے معنی حیات کے ہیں۔ اس زندگی کی عقل وسائل مندرجہ ذیل سے وابستہ ہے۔

- ❖ پرت یکشا (Pratyaksha) یعنی دریافت بوسیلہ محسوسات۔
- ❖ انومانہ (Anumana) قیاس واستدلال۔
- ❖ اپامانہ (Upamana) تطبیق۔
- ❖ شبدہ (Shbada) مفکرین سلف کے افکار کی تصدیق۔
- ❖ ارتاپتی (Arthapati) پرستش۔

تطبیق کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جو کسی چیز کو دیکھے، بغور سمجھے۔ اس کے بعد پہلے جیسی اشیاء کو دیکھ کر ذہن میں تطبیق وموازنہ کرے کہ یہ وہی چیز ہے یا اسی قسم کی ہے۔ مثلاً کسی نے طوطا دیکھا اور کچھ عرصہ بعد اور طوطے کہیں دیکھے تو پہلی صورت اس کے ذہن میں آجائے گی اور اس ذہنی تطبیق سے وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ بھی طوطا ہے۔

پرستش سے یہ مراد ہے کہ ہم ایک شخص کو جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہے لیکن گھر پر نہیں ہے تو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ کہیں باہر گیا ہے۔

میماسہ کا عقیدہ ہے کہ دنیا اور دنیا کی موجودات حقیقت ہیں، موہوم اور خیالی نہیں ہیں۔ اس کے پیرو خدا کو نہیں مانتے لیکن کہتے ہیں کہ ارواح بے شمار، مستقل اور ازلی و ابدی ہیں اور اس قانون کو بھی ابدی مانتے ہیں جو تمام کائنات میں جاری وساری ہے اور سلسلہ علل ومعلول کو منتظم کرتا ہے اور عمل کو بے نتیجہ نہیں چھوڑتا۔ جو شخص وید کے مطابق رسوم مذہبی بجا لائے اس کی روح توانا ہوتی ہے۔ مذہبی رسوم بجا لانے، نیاز دینے اور قربانی وغیرہ وغیرہ سے دیوتاؤں کو خوش کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ وید کا یہ حکم ہے۔ حکم کی تعمیل ہمارا فرض ہے۔ نتیجہ کی ضرورت نہیں۔ مثلاً جو منتر برائے بارش یا دفع قحط یا طول عمر واولاد وثروت یا فتح مندی ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہو یا نہ ہو صرف حکم کی تعمیل کے خیال سے بجا لانا چاہیے۔ اس فلسفہ کی تعلیم میں اس طرح تعمیل احکام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ذرا سے اختلاف سے کانٹ (Kant) نے بھی یہی کہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان

جو اپنا فرض سمجھے اسے نفع ونقصان کے خیال کے بغیر انجام دے۔

میماسہ کے عقیدہ میں سب سے بڑی خوش نصیبی، ابدی برکت اور بہشت جاوید ہے کیونکہ روح پاک ہو جائے گی۔ چونکہ روح کا معلومات سے علاقہ نہیں اس لئے جب علاقہ نہ ہوگا، تو پیدائش و مرگ کا دکھ بھی نہیں ہوگا۔ اس میں اس کی صفت حیات ہے، کیونکہ وہ خود ہی ذات ہے۔

❋❋❋

فلسفہ ویدانت

فلسفہ وید جو تمام مذاہب ہند میں شامل ہے اور مسیحی و اسلامی فکر و عقیدہ سے مشابہت رکھتا ہے، وید کی تعلیم سے متعلق ہے۔ میماسہ رسوم مذہبی پر زور دینا ہے۔ فلسفہ وید فکر و عرفان کو اخلاقی اور روحانی بناتا ہے اس لیے میماسہ وید کا علم الکلام ہے۔ اس کے دلائل و افکار متکلمین اسلام خاص کر اشاعرہ سے مشابہ ہیں۔ فلسفہ وید کو ہندو تصوف کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس کے افکار اسلامی متصوفہ کی طرح حکمت اور دیانت سے مرکب ہیں اور اس پر ریاضت اور تزکیہ نفس مستزاد ہیں۔ ''اپانی شد'' وید کی تفسیر ہے، جس میں وید کے حکیمانہ افکار سے بحث کی گئی ہے۔ برہمناس میں ویدائی رسوم کی تفصیل و تشریح ہے۔ وید، برہمناس اور اپانی شد تینوں کو الہامی مانا گیا ہے۔ وید کی نظم سب سے قدیمی ہے۔ اس کے بعد برہمناس اور پھر اپانی شد تصنیف ہوئیں۔ اسی ترتیب سے ان کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے یعنی وید بچپن اور اوائل جوانی میں۔ برہمناس ادھیڑ عمر میں اور اپانی شد بڑھاپے میں۔ وید جڑ ہے جو اپانی شد میں درخت بن کر شاخوں اور پتوں سے آراستہ ہو جاتی ہے اور شنکراچاریہ اور رامانوج کی تفسیر و تشریح سے اس میں پھل آجاتا ہے۔ شنکراچاریہ وحدت الوجود کا قائل ہے اور رامانوج خدا کو کائنات سے ممتاز مانتا ہے۔

❄❄❄

شنکراچاریہ

شنکراچاریہ نویں صدی میلادی میں زندہ تھا، لیکن ہندو اس کا زمانہ قبل از مسیح مانتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ قدیم بتاتے ہیں، کیونکہ مشرق میں قدامت کی خاص اہمیت ہے۔

شنکراچاریہ کے عقیدہ کے مطابق حقیقت یگانہ ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز حقیقی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہی ہے۔ اس کے دو رخ ہیں ایک ظاہر دوسرا باطن۔ جو کچھ ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں، وہ موہوم اور خیال ہے، جسے توضیح کے لیے سحر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حقیقت ازلی و ابدی بھی ہر لحظہ کسی نہ کسی شکل میں ظاہر رہتی ہے۔ کبھی بادلوں کی کثرت میں اس کا جمال سورج کو ڈھانپ لیتا ہے اور کبھی اس کے جلال کی درخشانی بادلوں کے ہجوم کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ پس حقیقت ازلی کی صفات میں سے ایک کثرت نمائی یا مایا (Maya) یعنی نقش خیالی ہے۔ تمام کائنات مایا ہے۔ ہمیں وحدت میں جو کثرت نظر آتی ہے یہ ہماری جہالت کا حجاب ہے۔ اگرچہ ہم اس حجاب جہالت کے متعلق کچھ نہیں جانتے کہ یہ کہاں سے اور کیسے آیا لیکن ہم بطور حق الیقین جانتے ہیں کہ وہ ہے اور ہم اس کے قبضہ میں ہیں۔ جب یہ پردہ ہماری آنکھوں سے اٹھ جائے گا، ہم اسے بے حجابانہ دیکھ سکیں گے۔ ہمیں اس دنیا میں بطریق ذیل زندگی بسر کرنی چاہیے:

1- بزرگان سلف کے افکار کا مطالعہ کریں اور کسی استاد کامل سے انہیں سمجھیں حتیٰ کہ استاد کہہ دے ”تم نے میری باتیں سمجھ لی ہیں۔“

2- حواس اور نفس حیوانی کو مکمل طور پر نفس رحمانی کے تابع کر دیں۔

3- عشق صمیم، آزادی اور رہبانیت اختیار کریں۔

❋❋❋

رامانوج

رامانوج وشنو کا پوجاری تھا، یعنی وشنو کو دوسرے دیوتاؤں پر فضیلت دیتا تھا۔ بھگتی یا عشق کو وسیلہ نجات سمجھتا تھا۔ اس کا زمانہ وہ ہے جب کہ شمالی ہند میں اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی اور بہت سے عالم و مبلغ جنوبی ہند میں پہنچ چکے تھے۔

رامانوج دکنی تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اس نے فلسفہ ویدانت کی شرح لکھی، جو اس کے عقیدت مندوں کا عقیدہ بن گئی۔ وہ کہتا ہے، حقیقت یگانہ ہے، لیکن اپنے اندر بے شمار حقائق رکھتی ہے، جو اس سے علیحدہ نہیں ہیں۔ وہ شنکر اچاریہ کی ''مایا'' یعنی خیالی دنیا سے انکار کرتا ہے، اس کا عقیدہ تھا، کہ موجودات کائنات بھی حقیقی ہیں، وہم وخیال نہیں۔

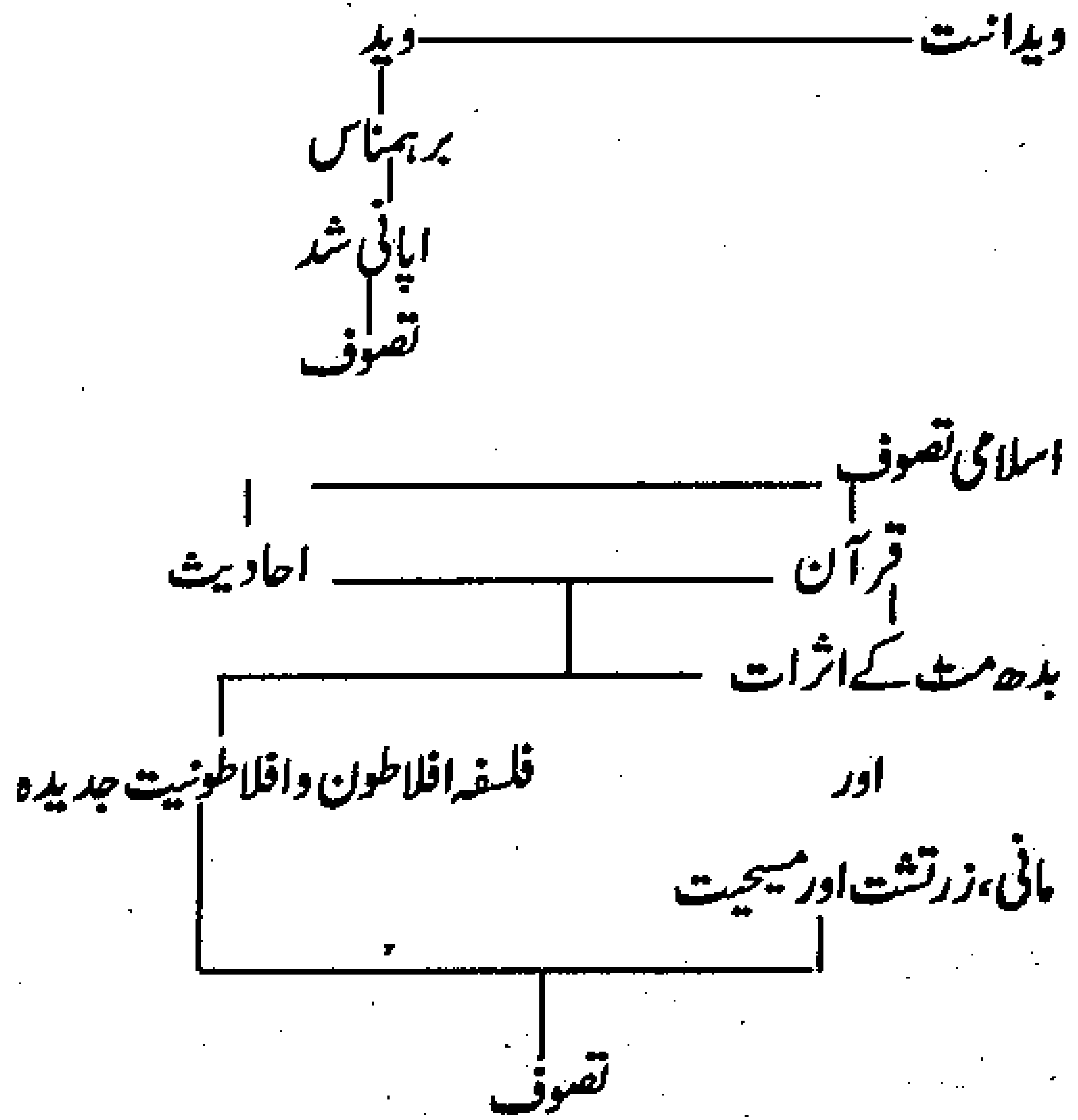
رامانوج کے نزدیک مادہ و روح حقیقت یگانہ رکھتے ہیں۔ ارواح باشعور ہیں اور مادہ بے شعور ہے۔ تمام صفات کا مالک خدا ہے جو ہر جگہ موجود ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ دانا و توانا ہے۔ مادیات و ارواح کا خالق ہے۔ ارواح بے شمار ہیں۔ چونکہ انتہائے تصور عقل ہے، اس لئے یہ آنو (Anu) یعنی بہت عقیل ہیں۔ یہ جواہر و پائندہ ہیں اور اعمال کی بنا پر جسم اختیار کرتے ہیں۔ جب جسم کے زندان میں آتے ہیں قید ہو جاتے ہیں۔ ان کی آزادی جسم کی قید سے آزادی ہے۔

صرف خدا ہی پرستش کے لائق ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اس کی طرف متوجہ رہے اور اس سے محبت کرے اور یقین کرے کہ اگر اس کی مشیت کو منظور ہے تو اس کا رحم شامل حال ہوگا اور اسے حقیقت کی طرف رہنمائی کرے گا۔

روح خدا نہیں ہے اور نہ اس میں واصل ہوتی ہے کیونکہ روح محدود ہے اور خدا

محدود۔ ہاں خدا کی صفات پیدا کر کے خدا نما ہو جاتی ہے۔لوہا آگ میں تپ کر آتش نما تو ہو جاتا ہے مگر لوہا ہی رہتا ہے۔موت کے بعد جسم فنا ہو جاتا ہے اور روح آزاد ہو جاتی ہے اور پھر اپنی جہالت و رغبت کے مطابق کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔

اگر چہ یہ فلسفہ تصوف اسلام سے مشابہ ہے، لیکن دونوں کی بنیادیں جداگانہ ہیں۔ فلسفہ رامانوج کی اصول وفروع حسب ذیل ہیں۔



اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ متصوفہ ہند، ویدانت اور ترکیب ریاضت سے متاثر ہوئے ہیں۔ویدانت اور تصوف کا اتصال ملاحظہ فرمائے۔

- امتیاز حق و باطن۔
- نفسانی خواہشات کے خلاف پرہیز گاری۔
- ضبط نفس و حواس۔
- عشق۔

میں قدر و منزل کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ یہ کوئی مستقل فلسفہ نہیں بلکہ دیگر مذاہب بالخصوص سانکھیہ، یوگ، میماسہ اور اپانی شد کے افکار سے تالیف ہوئی ہے اور انہیں زیادہ دلکش، شاعرانہ اور عارفانہ بنایا گیا ہے۔ اس کی اٹھارہ فصلیں ہیں۔ مطالب کی تکرار ہے، مگر ایسے انداز سے کہ دلکشی میں فرق نہیں آتا۔ پہلی اور دوسری فصل میں سانکھیہ اور یوگ کا فلسفہ ہے اور دونوں کو ہم نتیجہ ثابت کیا گیا ہے اور ان پر اضافہ کیا گیا ہے۔ سانکھیہ میں پروشہ اور پرکرتی مستقل اور جدا جدا ہیں، جن کا اتصال مادی زندگی ہے اور علیحدگی حیات ابدی۔ بھگوت گیتا نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ نہ پرکرتی کو اتنا شعور ہے کہ مادہ سے اتصال پیدا کرے اور نہ پروشہ اتنی احمق ہے کہ پرکرتی کے دام میں پھنس جائے، بلکہ ایک تیسری قوت جو توانا اور دانا و بینا ہے انہیں ملاتی ہے اور وہی انہیں جدا کرسکتی ہے۔ پس انسانی روح کو اس سے متوسل ہونا چاہیے اور اسی سے مدد طلب کرنا واجب ہے اور اپنے آپ کو اس میں مستغرق اور فنا کر دینا چاہیے اور اسی سے برکت ابدی اور سعادت سرمدی حاصل کرنی چاہیے۔

یوگ کہتا ہے کہ ریاضت اور تزکیہ نفس نجات کا وسیلہ ہے۔ بھگوت گیتا اس کی تائید کرتی ہے، لیکن ایک نکتہ بڑھاتی ہے کہ تزکیہ نفس، عبادت، پاکیزگی، آرزوئے بہشت یا زندگی کامل کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ محبوب ازلی ایسی زندگی کو پسند کرتا ہے۔

میماسہ کہتا ہے کہ عمل بے غرض سے فرض ادا ہوتا ہے، کیونکہ وید نے ایسا ہی بتایا ہے اور جو کچھ وید میں ہے خدائی ہے۔ بھگوت گیتا کہتی ہے کہ میماسہ صحیح کہتا ہے۔ حاکم وہی ہے اس لئے ہر حکم بلاغرض بجالانا چاہیے۔ برائی، بھلائی، غم، خوشی، ناکامی، موت اور زندگی نظر میں ہم رتبہ ہونی چاہیے کیونکہ یہ سب کچھ اسی محبوب کی طرف سے ہے اور دوست جو کچھ کرے درست ہے۔ وہی ہمیں اس مادی جسم میں لایا اور ہمارے لیے فرائض مقرر کیے۔ جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے اور ہم اس صورت میں جوابدہ نہیں ہیں۔ جب ہم جوابدہ نہیں تو ہم نے کچھ کیا ہی نہیں۔

سانکھیہ کہتا ہے کہ پراکرتی کے تین جوہر ہیں، جن کے نام ستوہ، رجس، تمس ہیں۔ان کے اتصال سے دنیائے مادی وجود میں آئی۔

بھگوت گیتا کہتی ہیں کہ یہ درست ہے، لیکن جب متلاشی میں استقلال آ گیا اور اس نے تزکیہ نفس کرلیا، تو وہ ان تینوں عنصروں سے بلند ہو گیا اور بجائے اس کے کہ ان کے تابع رہے خود انہیں اپنے تابع کر لیتا ہے۔

❋❋❋

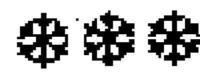
مذاہب ہند

مذاہب ہند میں آغاز شعور سے سورج، چاند، ستارے آسمان، زمین، چاروں عنصر، آواز، قوت نشو ونما، زمانہ، علت مرگ وغیرہ کی پرستش ہوتی تھی۔ اس زمانہ کے شاعر اپنی قوت متخیلہ کے مخلوق دیوتاؤں کی تعریف میں نظمیں کہتے تھے جو مرور ایام سے مقدس اور الہامی ہو گئیں۔ دوران نغمہ ہائے ستائش انہوں نے رسوم کو مرتب کیا، جو ابتداً مختصر اور سادہ تھیں مگر تدریجاً مفصل ہوتی گئیں۔

اس زمانہ کے عرفاء برہمن تھے اور مذہبی رسوم انہیں کی وساطت سے ادا ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنی اجرت بڑھانے کے لیے ان رسوم کو بھی بڑھایا۔ حتیٰ کہ دن تو دن ادائے رسوم کے لیے ہفتے، مہینے بلکہ سال گزر جاتے تھے۔ اس دوران میں برہمن اپنے حقوق اجرت کے طور پر لوگوں سے گائیں، بچھڑے، خوراک، لباس اور مکان حاصل کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس ہزاروں گائیں اور بچھڑے ہو گیے۔ بعض محققین کے قول کے مطابق ایک ایک رسم کے لیے برہمنوں کو دوسو سے چالیس ہزار تک گائیں اور بچھڑے ملتے تھے۔ اسی لالچ نے برہمنوں کو اکسایا کہ وہ وید کے افکار کو فلسفیانہ بنائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوہامی دیوتا جو شعراء کی زبان اور اعمال سے مجسم ہو گیے تھے، دوبارہ فکری اور خیالی ہو گئے۔ اسی دوران میں بدھ پیدا ہوا اور جین مت نے قوت حاصل کی۔ یہ دونوں مذہب وید کو الہامی نہیں مانتے تھے۔ قربانی اور رسوم مذہبی کے بھی منکر تھے۔ اب پھر فلسفیانہ افکار پیدا ہوے، لیکن فلسفی بہت کم تھے۔ عوام الناس ان بلند افکار کی تفہیم سے عاجز تھے۔ اسی لیے طبقہ عوام میں فلسفہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ عرفاء نے فلسفہ سانکھیہ کے تینوں جواہر ستوہ، رجس اور تمس کی بجائے سورج کے تین مقام یعنی طلوع، نصف النہار، اور غروب کو تین دیوتاؤں کے نام سے عوام میں روشناس کرایا۔ ان میں سے ایک کا

نام برہما رکھا جسے خالق مانا گیا۔ دوسرے کا وشنو جسے پروردگار کا درجہ دیا۔ تیسرے کا نام شیوہ یا شنکر رکھا اور اس کی صفت نابود کرنے والا مقرر کی۔ سانکھیہ کے تینوں جواہر کا اتصال زندگی ہے۔ مذکورہ تینوں دیوتا بھی ہمیشہ کام میں مصروف رہتے ہیں اور ان کا اتصال و اجتماع زندگی اور موت کا صورت گر ہے۔

ہر دیوتا کی بیوی اور خاندان ہے۔ برہما کی بیوی کا نام سرسوتی ہے جو عقل اور موسیقی کی دیوی ہے۔ وشنو کی دیوی کا نام لکشمی ہے جو دولت اور خوش اقبالی کی دیوی ہے۔ پاربتی، کالی، درگا اور چاؤ مندی، شیوہ یا شنکر کی بیویاں ہیں۔ شیو کی چاروں بیویاں کبھی چار افراد، کبھی دو اور کبھی ایک کا مفہوم پیدا کرتی ہیں۔ شیو کے بیٹے کا نام گنیش دیوتا ہے، جس کا سر اور منہ ہاتھی کا ہے اور ہندوؤں میں محبوب ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال سے مذکورہ دیوتاؤں کی پرستش ہو رہی ہے، لیکن اس وقت برہما کی پرستش کم ہو گئی ہے۔ شیو اور اس کی بیویاں بھی وشنو کے مقابلے میں مات کھا چکی ہیں۔ اب عام ہندو وشنو کے پیرو اور اس کے مظاہر کے عقیدت مند ہیں۔ ان میں سے رام چند اور کرشن، ہندوؤں کے نزدیک بے حد محترم اور معظم ہیں۔ ان سے قطع نظر کوئی ایسی چیز نہیں جسے کسی نہ کسی طرح پوجا نہ جاتا ہو۔ سانپ، زمانہ، عقاب، عقل وغیرہ۔ گائے زراعت کی دیوی ہے۔ اسی طرح خاص خاص درخت اور پھول بلکہ پتھر بھی مقدس و محترم ہیں۔ فلسفہ کتابوں کی زینت ہے اور عوام اوہامی رسومات اور خرافات کے مقید و اسیر ہیں۔



فلسفہ یونان

ہند و یونان کی قدیم ترین منظومات و گفتار مظاہر طبعی سورج، چاند، آگ، پانی، ہوا، آسمان، زمین، دریا، خشکی، طوفان، آب و ہوا، رات، دن، شفق، روشنی، تاریکی، ستارے دن رات کی درازی اور کوتاہی سے متعلق تھیں۔ انہوں نے ان مظاہر کو مجسم کر کے ان کی اشکال معین کر لی تھیں اور انہیں دیوتاؤں سے منسوب کیا تھا۔ دیوتا مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان میں زن و شوئی بھی تھی۔ ان کے اولاد بھی تھی۔ بھائی بہنیں بھی تھیں اور ان کی اوہامی قہرمانیوں سے ان کے صفات بھی معین کر رکھے تھے۔ انہیں کی پوجا ہوتی تھی۔ پوجا کا مقصد تحصیل خیر اور دفع شر کے سوا کچھ نہ تھا۔

ان دیوتاؤں کی آپس میں رقابتیں تھیں۔ لڑائیاں لڑتے تھے۔ کبھی فاتح ہوتے تھے، کبھی مفتوح، مناجات، موسیقی، قربانی اور ریاضت سے حاضر ہوتے تھے اور معتقد کی آرزو بر لاتے تھے۔

اتفاقاً کوئی طاقتور انسان یا مرتاض کسی دیوتا پر غالب بھی آ جاتا تھا۔ دیوتا سے جو وہ وعدہ لیتا اسے مجبوراً پورا کرنا پڑتا۔ شاید اسی لیے مہاتما بدھ نے کہا ہے کہ دیوتا، انسان کی طرح مجبور اور محتاج ہیں۔

ہند و یونان کے منظومات اور طریق پرستش میں جو امتیاز پایا جاتا ہے وہ آب و ہوا، اور دو آریائی قوموں کا ماحول ہے۔ ہندی مادیات سے مجردات پر پہنچے۔ انہوں نے کلیات لے لیں اور جزئیات پر توجہ نہ کی اور یونانی اور ان کے جانشین موجود اہل فرنگ نے تدریجاً حسن، سیاست اور اجتماعیات سے نکل کر جزئیات کا تجزیہ کیا اور کلیات سے

آنکھیں بند کرلیں۔ اس وجہ سے ہندوستانی، روحانی، سادہ اور قانع بن کر عمل سے دور رہے اور فرنگی مادی، خوشحال، بلند حوصلہ، محنتی اور کارکن ہو گئے۔

یونانی فلسفہ کے تین دور ہیں۔

1- یونانی مفکروں نے ممالک مشرق مصر، بابل اور ایران میں فلسفہ کی جستجو کی۔

2- ان کے افکار میں استقلال اور قوت ایجاد پیدا ہوئی۔

3- یونانی افکار خالصتاً یونانی نہ تھے بلکہ غیر ممالک کے افکار بھی ان میں شامل کیے گیے۔

پہلے دور کے مفکرین میں سے طالیس (Thales) ساتویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں اس کا مولد شہر ملیتوس (Miletus) ایرانی حدود میں ایک اہم مقام تھا۔ طالیس نے ستارہ شناسی اور دوسرے مروجہ علوم حاصل کیے اور یونان کے مشہور مفکروں کی صف میں شامل ہوا، لیکن یہ تحقیق نہیں ہوسکا کہ وہ یونانی تھا۔

ہیرودت ابوالمورخین نے اسے ابوالحکماء لکھا ہے۔ اس کے عقیدے کے مطابق پانی ہر چیز کی اصل ہے۔ سب کچھ پانی سے پیدا ہوا اور اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔ انکسا مندر(Anix mandor) اس کے اہم شہری اور جانشین نے جس کا زمانہ ۶۱۰ ق۔م ہے۔ اس کے فلسفہ کو زیادہ گہرا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جوہرا اصلی و حقیقی حدود زمان و مکان سے بے نیاز ہے۔ اس کا کوئی آغاز و انجام نہیں۔ وہ نامعین ہے۔ اس کی تعریف ناممکن ہے۔ اس نے عناصر چہارگانہ پیدا کیے اور ان کی ترکیب سے دنیا بنی۔ یہ نظریہ سانکھیہ کے اس نظریہ سے ملتا جلتا ہے کہ ”پراکرتی ناقابل تعریف اصل و جوہر ہے۔“

انکسا مندر عقیدہ کے مطابق زمین بچھی ہوئی نہیں، بلکہ ہوا میں معلق ہے، اس کے بعد انکسا مینس (Anax Menes) نے ہوا کو جوہر حقیقی سمجھا۔ وہ کہتا ہے کہ ہوا کے سرد، گرم، تر، خشک، منجمد یا آبی ہونے سے مختلف اشیاء پیدا ہوئیں۔

اسی زمانہ میں کورش اعظم نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا۔ اور بحیرہ سفید تک بڑھ کر یونانی نو آبادی ایونیہ پر قبضہ کرلیا اور یہ علاقہ ایرانی شہنشاہیت کے زیر اقتدار آ گیا۔ اس سے ایران و یونان میں نہایت قریبی تعلقات پیدا ہوئے حتیٰ کہ سکندر اعظم اور اس کے

جانشینوں تک دونوں قومیں آپس میں مخلوط رہیں اور طبعی طور پر ایک دوسری کے افکار سے متاثر ہوئیں۔ ہاں مذہب کے اختلاف نے ایک دوسری کو قدرے دور رکھا۔ ضمنی طور پر مرکز علم ملیتوس سے افیسوس میں منتقل ہوگیا۔ چند مفکر وہاں جمع ہو گئے انہیں میں سے ہرکلیتوس تھا، جو دارائے اعظم کا ہمعصر تھا۔ یہ حکیم گوتم بدھ کی طرح مادی زندگی سے بدظن تھا اور اسی لیے گوشہ نشیں ہوگیا اور دارا کے بلانے کے باوجود نہ آیا۔ دارا نے دربار میں بلایا، تو معذرت کردی اور اپنی سادہ زندگی کو شاہی جلال و جاہ پر ترجیح دی۔ اس حکیم کا عقیدہ تھا کہ آگ ہر چیز کی اصل ہے، اگر وہ آگ نہیں تو کوئی ایسا جوہر ہے جس کا مظہر آگ ہے۔ چونکہ آگ یا نور ہمیشہ متحرک اور تغیر پذیر ہے، اس لیے کوئی چیز ایک حالت پر نہیں رہتی، یعنی اشیاء متواتر متحرک اور متغیر ہیں، دریا کے قطروں کی طرح جو لمحہ بھر کو ایک جگہ اور ایک حالت پر قائم نہیں رہتے اور اپنے منبع سے نکل کر پھر منبع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ ایک نقطہ نظر سے ہر وقت ایک ہی جگہ پر اور دوسرے نقطہ نگاہ سے کسی وقت ایک ہی جگہ پر نہیں ٹھہرتے۔ یہ نظریہ بودھ کے اس نظریہ سے مشابہ ہے کہ ''کوئی چیز ایک حالت پر نہیں رہتی۔''

ہرکلیتوس کا عقیدہ تھا کہ حرکت زندگی کا اظہار ہے۔ یہ اضداد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک موت ہے اور دوسری زندگی۔ ایک زندگی ہے اور دوسری موت۔ مولانا رومی کہتے ہیں،

این جہاں جنگ است گل چونگری
ذرہ با ذرہ چو دیں با کافری

آن یکے ذرہ ہمے پرد بہ چپ
و آں دگر سوئے یمیں اندر طلب

ذرہ بالا و آن دیگر نگوں
جنگ فعلے شاں ببیں اندر رکوں

ایں جہاں زیں جنگ قائم مے بود

در عناصر درنگر تا حل شود

چار عنصر چار استون قوی ست
کہ بر ایشاں سقف دنیا مستوی است

ہر ستونے اشکنندہ و آں دگر
استن آب اشکنند آں شرر

پس بنائے خلق بر اضداد بود
لا. جرم جنگی شدند از ضر و سود

ہست احوالت خلاف ہمدگر
ہر یکے باہم مخالف در اثر

چونکہ ہر دم راہ خود را مے زنی
با دگر کس سازگاری مے کنی

فوج لشکر ہائے احوالت بہ بیں
ہر یکے با دیگرے در جنگ و کیں

مینگر درخود چنیں جنگ گراں
پس چہ مشغولی بہ جنگ دیگراں

حرکت، اضطرار اور حرارت جو ہمیں نور و آتش میں دکھائی دیتی ہے یہ ایک جنگ زرگری ہے، جو اشیاء کو مختلف صورتوں میں ڈھالتی ہے۔ یہی حرکت، اضطراب و سکون اور اعتدال باطن میں بھی ہے، جو انجام کار ہر چیز کو حقیقی مکان و صورت میں لوٹا دیتی ہے۔ پس تمام اشیاء اور انسان بھی بظاہر متحرک اور بے آرام ہیں اور انجام کار جب اپنی اصل سے واصل ہوتے ہیں تو حرکت اور بے چینی چھوڑ کر پر سکون حالت میں آ جاتے ہیں۔

بقول رومی:

ہست بے رنگی اصول رنگہا
صلحہا باشد اصول جنگہا

ہندی مفکروں کے افکار بھی قریباً ایسے ہی ہیں جیسے بیان کیے جا چکے ہیں۔

ہرکلیتوس کے بعد مشہور مہندس فیثا غورث (۵۸۲ق۔م تا ۵۰۰ ق۔م) بڑا اہم مفکر ہے۔ یہ ایک خاص طریق فکر کا بانی ہے جسے نظریہ فلسفہ اعداد کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ فیثا غورث نے عرصہ دراز تک ممالک مشرق بالخصوص مصر، بابل اور ایران کا سفر کیا اور ان ممالک کے مفکرین سے مستفید ہوا۔ مصر میں کمبوجیہ نے اسے گرفتار کرلیا اور اپنے ساتھ شام میں لے گیا۔ وہاں کمبوجیہ مرگیا اور فیثا غورث کو آزادی نصیب ہوئی۔ آزاد ہوکر یہ حکیم بابل پہنچا اور وہاں سے علم ریاضی، حساب، الٰہیات کی تحصیل کی۔ بعض کا قول ہے کہ اس نے ہندوستان کی سیاحت بھی کی۔

جب فیثا غورث واپس وطن پہنچا، تو اس نے ایک روحانی واخلاقی انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے اراکین آپس میں بے حد متحد اور متعاون تھے۔ چونکہ انجمن کے کام پوشیدہ رکھے جاتے تھے، اس لیے یہ انجمن باطنیہ سے مشابہ تھی۔

کہا جاتا ہے کہ فیثا غورث نے ہندوستان کا بھی سفر کیا تھا، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ چونکہ اس کے افکار ہندی مفکروں سے ملتے جلتے ہیں، اس لیے محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔

فیثا غورث تناسخ کا قائل تھا، گوشت خوری اسے ناپسند تھی۔ اعداد کو بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا، بلکہ انہیں تمام حقائق کی اصل سمجھتا تھا۔ اسی طرح آوازوں کی ترکیب کو بھی اعداد کا تناسب جانتا تھا، بلکہ وہ کائنات کو موسیقی اور موسیقی کو ہر چیز کا حسن خیال کرتا تھا اور اس حسن کا ماخذ اعداد کو ہی قرار دیتا تھا۔

فیثا غورث کے ہاں طاق اعداد کو جفت پر برتری حاصل ہے۔ وہ پہلے عدد کو بہت اہمیت دیتا تھا اور اسے اعداد کی اصل اور جوہر سمجھتا تھا۔ چار کا عدد اُس کے ہاں کامل تھا اور اسی لیے اسے اہم شمار کرتا تھا۔

کائنات کے متعلق اس کے نظریات زرتشت سے مشابہ ہیں۔ وہ جاندار اور بے

جان سب کی روح کا قائل ہے۔ سائنس میں وہ یورپ کے سائنس دانوں کا قدیم ترین استاد ہے۔ وہ زمین کی گردش کا قائل ہے۔

فیثاغورث کی اپنی کوئی تصنیف باقی نہیں۔ جو کچھ اس کے متعلق کہا جاتا ہے اس کے راوی اس کے شاگرد ہیں۔ سوگلر (Sewhegler) کے قول کے مطابق اس کا فلسفہ رموز ریاضی ہے۔ وہ ہندوستان اور ایران کے مفکرین کی مانند مانتا تھا کہ دنیا میں ایک قانون موجود ہے جس کی وجہ سے اشیائے عالم نظم واعتدال پر ہیں، لیکن اشیاء کا ارتباط اعداد کا مرہون منت ہے۔ وہ سادگی، زہد اور ریاضت کا معتقد تھا اور انہیں وسیلۂ نجات روح سمجھتا تھا۔

مہاجرین یونان میں سے کچھ فلسفی جزیرہ سسلی میں رہتے تھے، جو ایلیات (Eleates) کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا فلسفہ ایلیاتی کہلاتا تھا۔ ان فلاسفہ میں سے کسینو فانوس اور ہرمیندس مشہور تھے۔ کسینو فانوس پانچویں صدی کے شروع میں زندہ تھا، جو بت پرستی اور دیوتا پرستی کی بجائے تمام آلودگیوں سے پاک ومنزہ وازلی وابدی حقیقت یگانہ کا معتقد تھا۔

ہرمیندس تغیر وتبدل کا معتقد نہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وجود ساکن ہے جو بظاہر متغیر ومتحرک نظر آتا ہے۔ یہ خاک وآتش کے اثر سے ہے، کیونکہ اگر وجود متحرک ہو، تو اسے مکان کی ضرورت ہے اور مکان یا وجود ہے یا عدم۔ وجود کی صورت میں وجود، وجود میں ہے، یعنی اپنے آپ متحرک ہے۔ یہ تحرک نہیں درحقیقت سکون ہے۔ عدم کی صورت میں عدم میں وجود کی حرکت منطقی نہیں۔ وہ وجود کو فلسفہ سانکھیہ کی پراکرتی کی طرح ایک ٹکڑا خیال کرتا تھا۔ وہ خلا کا بھی معتقد نہ تھا۔ اس کا شاگرد امپدوکلیس (Empedocles) سسلی کا باشندہ تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسان، جمادات ونباتات وحیوانات کی منزل سے گزر کر انسانیت تک پہنچا ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں:

از جمادی مردم و نامی شدم
و ز نما مردم بہ حیوان سر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم
پس چرا ترسم ز مردن کم شوم
حملہ دیگر بمیرم از بشر
تا بر آرم از ملائک بال و پر
از ملک ہم بایدم جستن ز جو
کل شئی ھالک الا وجہہٗ
باز دیگر از ملک قرباں شوم
آنچہ اندر وہم ناید آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں
گویدم کانا الیہ راجعون

امپدوکلیس بھی فیثا غورث کی طرح جاندار کا گوشت کھانے سے پرہیز کرتا تھا اور جاندار کی زندگی کو خواہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو، محترم سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ کائنات دو قوتوں سے مرکب ہے۔ ایک مہر و محبت اور دوسری کشمکش و جدائی۔ لیوکپوس (Leucippus) نے ذرات کا نظریہ پیدا کیا اور اس کے شاگرد دیموکریتس (Democritus) نے اسے مشرح کیا اور یہ نظریہ ہندوستان میں بھی موجود تھا۔ دیموکریتس کا نظریہ یہ تھا کہ دنیا ذرات سے بنی ہے۔ یہ ذرات بہت چھوٹے اور لاتجزیٰ ہیں۔ ملا و خلا وجود و عدم دونوں مخصوص ذرات کی ترکیب کا نتیجہ ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ ذرات آغاز و انجام کے بغیر ہیں اور ان کا تجزیہ ممکن نہیں۔ سب کی اصل ایک ہے۔ خواہ نرم ہوں یا سخت ترکیب مخصوص انہیں مختلف شکلوں میں لاتی ہے۔ محبت و پیوستگی لاشئے کو شئے اور جدائی، شئے کو لاشئے بنا دیتی ہے۔ اس لحاظ سے مکان و خلا، جنبش و ملا، لازم و ملزوم ہیں۔ ہر عنصر مخصوص ذروں کی پیداوار ہے۔ مثلاً آگ نہایت چھوٹے

اور گول ذروں سے ، سیاہ رنگ ملائم ذروں سے ، ترش ذائقہ چھوٹے چھوٹے تکونے ذروں سے، مٹھاس بڑے بڑے گول ذروں سے بنتی ہے۔

روح بھی نہایت چھوٹے چھوٹے آتشی ذروں سے بنی ہے، جسے مغز میں ہو تو عقل ، دل میں ہو تو ہمت و شجاعت اور جگر میں ہو تو نفسانی خواہشات کہا جاتا ہے۔ احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب ذرات محسوس سے جدا ہو کر انسانی حواس سے ملتے ہیں۔

اس ترتیب سے فیثا غورث کے اعداد، ہر کلیتوس کا تحرک، ہرمیندس کا سکون، دیموکریتس کے ذرات ایک ہی مفہوم میں مختلف ناموں سے مذکور ہیں۔ ہرمیندس کے قول کے مطابق حرکت و تغیر حواس کے اوہام ہیں، کیونکہ حقیقت بے تغیر اور ساکن ہے۔ یہ عقیدہ ویدانت سے مشابہ ہے جو کہتی ہے کہ حقیقت ساکن ہے اور حرکت و سکون کو دریا کے پانی سے تشبیہ دیتی ہے کہ سطح پر لہریں مد و جزر پیدا کرتی ہیں۔لیکن ان کی تہ ساکن ہے۔

انکساغورث (Anaxagoras) ۵۰۰ ق۔م میں پیدا ہوا۔اس کے عقیدہ کے مطابق ہر چیز میں وہ استعداد موجود ہوتی ہے۔ جو اسے مستقبل میں ظاہر کرتی ہے اور جب تک استعداد نہ ہو، کچھ نہیں ہوتا مثلاً بیج میں درخت ہونے کی استعداد ہے، اسی لیے وہ مستقبل میں درخت بن جاتا ہے۔ اسی طرح روٹی میں چربی ، خون اور گوشت کی استعداد ہے آخر کار تجزیے اور تصفیے کے بعد جگر اور دل سے گزر کر جب مغز میں پہنچتی ہے تو فکر بن جاتی ہے۔اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ سورج اور چاند نظم جہاں کی علت ہیں۔ سورج سنگ آتشین ہے اور چاند جسم خاکی۔ عقل تمام چیزوں کو جو دراصل غیر منظم اور بے ترتیب تھیں، نظم و ترتیب میں لائی۔

سوفسطائی (Sophist) جو عربی اور فارسی میں سوفسطائی مشہور ہیں ایسے لوگ تھے، جو عقل کو ثروت، وجاہت اور شہرت کا ذریعہ جانتے تھے اور ایک نکتہ لے کر اس کے

ثبوت یا نفی میں مباحثے اور مناظرے کرتے تھے۔ آخر اس نے منطق تشکیل پائی اور تقریر و مناظرے کی قوت کو ترقی ملی۔ زمانہ اسلام میں حکماء کا مطلوب فقہ ہوئی۔ سوفست کبھی کسی کی بات کو قوت بیانی سے جھٹلاتے تھے اور کبھی تصدیق کرتے تھے۔ ان میں سے بعض نے بحث و مناظرے میں بڑے بڑے نکات بیان کیے ہیں اور نیک ارادہ سے حقیقت فہمی کی روش بھی اختیار کی ہے۔

سقراط بہت بڑا حکیم اور مفکر تھا۔ وہ سوفسطائی نہیں تھا، لیکن اس کا طرز بیان سوفسطائی تھا۔ اسی لئے بعض اسے سوفسطائی سمجھتے ہیں۔

مولانا روم کہتے ہیں:

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم
ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم
در حق او مدح و در حق تو ذم
در حق او شہد و در حق تو سم
در حق ور نور و در حق تو نار
در حق او ورد و در حق تو خار
ہندیاں را اصطلاح ہند مدح
سندیاں را اصطلاح سند مدح

مولانا نے اس تمہید سے فکر کو عرفانی کر دیا ہے اور اس تمہید کے بعد نکات عالی میں کھو جاتے ہیں۔ سوفسطائی عقیدہ نیکی یا بدی کا معیار نہیں ہوتا مگر جو کچھ کسی کی نگاہ میں خوب یا بد معین ہو چکا ہے، وہی اس کا عقیدہ ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسی طرح اپنے لیے امتیازات حاصل کر لیے ہیں اور قانون و عدالت محض کمزوروں کو عاجز و مجبور کرنے کے لیے ہے۔ سوفسطائی عام طور پر حقیقت کو جاننا ہی نہیں چاہتے۔ ان کا مقصد دوسرے پر غلبہ پانا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے ایسے اشخاص بھی پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے حقیقت پسندی اختیار کی۔ ان میں سے پروتاغورث (Protogoras)،

پرودیکوس (Prodicus) اور ہپیاس (Hippias) ایسے ہی مفکر ہیں۔ پرودیکوس مہاتما بدھ اور دوسرے ہندی مفکرین کی مانند ہے، جو مادی زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق زندگی ایک مصیبت ہے، جس سے نیکی، شائستگی، اخلاق اور صبر ہی نجات دلا سکتے ہیں۔

ہپیاس کہتا تھا۔ خوبی کی بنیاد' سچائی ہے'' جس کا اثر ہر مذہب اور ہر عقیدے میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی مذہب جھوٹا نہیں ہے اور کوئی ایسا عقیدہ نہیں، جو سراسر باطل ہو۔ بقول رومی:

پس بد مطلق نباشد در جہاں
بد بہ نسبت باشد ایں را ہم بداں

پروتاغورث کے عقیدے کے مطابق تمام اشیاء کا معیار خود انسان ہے۔ گورگیاس کہتا تھا ''ہر گروہ اور ہر زمانہ میں' سچائی پائی جاتی ہے جو اس گروہ اور زمانہ کے لیے موزوں ہوتی ہے۔

سوفسطائی افکار ناپید ہیں۔ جو کچھ میسر ہے، یہ بعد کے لوگوں کی آرائیں۔ انہیں میں سے ایک ارسطو ہے، جو اپنی مصنفات میں ایسے مفکرین کے افکار کے متعلق نشاندہی کرتا ہے۔

❄❄❄

سقراط

سقراط ۴۶۹ ق۔م میں پیدا ہوا۔ اس نے جوانی میں ورزش اور علم موسیقی حاصل کیا اور اس کے بعد ریاضی اور ستارہ شناسی سے بھی آگاہی حاصل کی۔ شروع میں یہ ایک مجسمہ ساز تھا۔ تدریجاً اس کو ترک کر کے تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے بیوی اور خاندان سے تعلق نہ تھا۔ ہمیشہ ورزش گاہوں اور لوگوں کے اجتماعات میں جاتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ سب کی باتیں سنے۔ اس کا خیال تھا کہ خدا نے اسے اسی کام پر مامور کر رکھا ہے۔ وہ حسن سے بے بہرہ تھا، لیکن ایسی سیرت رکھتا تھا کہ ہر ایک ناواقف اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ جب کسی سے مخاطب ہوتا تو اسے اپنا گرویدہ بنا لیتا اور اس کا ہم خیال ہو کر اس سے حالات دریافت کرتا تھا۔ اپنے آپ کو ناواقف بنا لیتا گویا کہ وہ اس کا مقصد نہیں سمجھا اور صحیح طور پر سمجھنا چاہتا ہے۔ اگرچہ سقراط کسی نئے فلسفہ کا بانی نہیں، لیکن اس نے افلاطون جیسا شاگرد پیدا کر لیا، جس نے یونانی فلسفہ کو ایک بلند مقام عطا کیا۔

سقراط ایک اخلاقی اور روحانی بزرگ تھا، جس کی خوراک نہایت سادہ تھی اور بے حد قانع تھا۔ گرمی ہو یا سردی ہو اس کا لباس ایک ہی قسم کا ہوتا تھا اور ننگے پاؤں رہتا تھا۔ اس نے ستر سال تک نیکی اور پاکیزگی کی زندگی گزاری اور وطن و اہل وطن کی بے حد خدمت کی۔ افسوس کہ اہل وطن نے اس کی قدر نہ پہچانی اور آئین ملک کے مطابق زہر کا پیالہ پلا کر ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

سقراط کے حالات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ انصاف اور خوبیوں کا دلدادہ تھا۔ اس کا اخلاق نہایت بلند تھا۔ لڑائی کے میدان میں جان باز اور محفل میں فصیح البیان و متبسم تھا۔ دوستی میں صحیح اور صمیم تھا۔ وطن پرست و آئین پسند تھا۔ منصف مزاج اور خوش اخلاق تھا، وجدان صحیح کے لیے میزان حق و باطل تھا۔ نیکی اور بدی کو سمجھتا تھا۔

تہذیب اور شائستگی اس کی گھٹی میں تھی، لیکن اس کی اخلاقی تعلیم ہندوستانی یوگیوں کی طرح زہد و عبادت، مراقبہ و یکسوئی اور ترک عوام تھی۔ وہ جس قدر محفل و جلوت پسند تھا، اس سے کہیں زیادہ خلوت و تنہائی کا شیفتہ تھا۔ وہ کہتا ہے "انسان کو جماعت کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے، کیونکہ جمادات و نباتات اور حیوانات اس کے استفسارات کا جواب نہیں دیتے۔ جہالت کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اپنا مفاد جماعت کے مفاد سے وابستہ رکھنا چاہیے۔"

اس کا طریق بحث اگر چہ سوفسطائی قسم کا تھا، لیکن فسطائی طریق مناظرہ اس کے ظہور کے بعد ختم ہو گیا اور نیا طریق بحث جاری ہوا جسے افلاطون اور ارسطو نے کمال پر پہنچا دیا۔

سقراط کا سوفسطائی مناظرہ فقط مناظرہ نہیں تھا، کیونکہ وہ مناظرہ سے اخلاقی نتائج حاصل کرتا تھا اور حقیقت تک پہنچتا تھا۔ مسائل کی تحقیق و تدقیق کر کے نئے نئے نکتے پیدا کرتا تھا۔ اگر اسے مقابل کا کوئی نقطہ صحیح معلوم ہوتا تھا، تو وہ اسے منطقی اور مدلل کرتا تھا۔

کتب مذہبی رگ وید، تورات اور اوستا میں دیکھا جاتا ہے کہ ان میں خدا یا زمانے یا اپنے نفس سے سوال کیے گیے ہیں، مگر جوابات نہیں دیے گیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پڑھنے والا خود انہیں سوچے اور اس طرح سوالات کرے۔

سقراط بحث میں کبھی حریف کی تقریر کے نواقص بیان کرتا تھا اور کبھی اس کی داد دیتا تھا اور بعض دفعہ توضیح کے بغیر مناظرہ ختم کر دیتا تھا، تاکہ سلسلہ فکر سلامت رہے۔

یہ طریقہ افکار کی صحت و سلامتی کے لیے بے حد اہم تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بے علم مان کر دوسروں کے افکار سے استفادہ کرتا تھا۔

سقراط کی کوئی تصنیف ہم نہیں پہنچی، جو کچھ اس کے متعلق کہا جاتا ہے لوگوں کی روایت ہے۔ ممکن ہے کہ راویوں نے اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی کی ہو۔

اس کا سب سے بڑا راوی اس کا شاگرد افلاطون ہے، جو سقراط کی زبان سے اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ یقیناً جو کچھ وہ کہتا ہے سقراط نے اسی طرح نہیں کہا ہوگا۔

سقراط کا فلسفہ مختصراً یوں ہے:

توحید☆

یونان کے متعدد خداؤں کا عقیدہ باطل ہے اور حقیقت واحد ہے۔

عقل☆

عقل کے مدعی کی خوبی عقل ہے۔ جس میں خوبی نہیں عقل بھی نہیں۔

غور و فکر☆

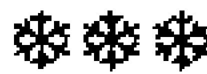
انسان کو انصاف و بے انصافی اور سچ، جھوٹ میں تمیز کرنی چاہیے۔

غور و فکر☆

مسئلہ زیر بحث کی جزئیات معلوم کرنے کے لیے مختلف نقاط نظر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

روح☆

روح حقیقی مجرد ہے اور جسم سے جدا ہے۔ جسم کی موت روح کی موت نہیں، بلکہ اس کی آزادی کا ذریعہ ہے، اس لیے انسان کو موت سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ اگرچہ تمام لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں لیکن چند ہی اس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بہت کچھ سکھانا چاہتا تھا، لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ انہوں نے ممنون ہونے کی بجائے اسے زہر پلا کر خاموش کر دیا۔



افلاطون

۴۲۷یا۴۲۹ق۔م میں پیدا ہوا۔۸۰سال کی عمر پائی۔اس کا اصلی نام ارستوکلیس (Aristocles) تھا۔ باپ کا نام ارستن (Ariston) تھا۔ افلاطون وسعت عقل کے باعث پلاتون یعنی وسیع الصدر کہلاتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کے سینہ کی وسعت کے باعث یہ نام سقراط نے رکھا تھا۔ اس زمانے میں لوگ بزرگوں کو ایسے ہی القاب دیتے تھے۔ اگر کوئی بادشاہ اس زمرہ میں آتا، تو وہ خود اپنا لقب تجویز کر لیتا تھا۔

افلاطون ۱۸ سال کی عمر میں سقراط کا شاگرد ہوا اور دس سال تک اس سے تربیت حاصل کی۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا پہلا استاد کرتیلوس (Cratilus) تھا۔ اس کے بعد بیس سال کی عمر میں سقراط کا شاگرد ہوا اور آٹھ سال تک اس سے تعلیم حاصل کی۔

جب سقراط نے زہر کی موت پائی، تو افلاطون ایتھنز سے چلا گیا اور کچھ عرصہ میگرہ (Megara) اور کرین (Cyrene) اور مصر اور یونانی نو آبادیات میں پھرتا رہا، ایتھنز میں واپس چلا آیا، مگر ایتھنز میں دل نہ لگا اور جزیرہ سسلی میں چلا گیا۔ وہاں فیثا غورث کے شاگردوں سے ملاقات کی اور ان کے افکار و فلسفہ کو حاصل کیا۔ خیال ہے کہ اسے انہیں دنوں ایک مدرسہ جو ہر نقطہ نظر سے مکمل ہو، قائم کرنے کا خیال آیا۔ لہٰذا اس نے انسانی خدمت کے لیے کمر باندھی اور سادہ زندگی اختیار کر لی۔ کہتے ہیں کہ اس نے بارہ سال تک سیاحت کر کے تجربات جمع کیے۔ جہاں کہیں کوئی مفکر پاتا، اس سے استفادہ کرتا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس نے فلسطین پہنچ کر علمائے بنی اسرائیل کو دیکھا، بلکہ ہندوستان تک کا سفر کیا۔ اس خیال کی بنیاد اس کے افکار کی مفکرین ہند کے افکار سے مشابہت ہے۔

جزیرہ سسلی سے ۳۸۷ق۔م میں ایتھنز واپس پہنچا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس یا

کچھ زیادہ برس کی تھی۔ اگر چہ یہ زمانہ ادھیڑ عمری کا تھا، لیکن اس کا ذہن جوان تھا۔

افلاطون کے افکار عمیق، جاذب اور شاعرانہ ہیں۔ اس کی تصنیفات نثر میں ہیں، لیکن وہ نثر ایسی دلکش اور شیریں ہے کہ نظم کو شرمندہ کر دیتی ہے۔ بعض فلاسفہ منطق و استدلال کے دلدادہ ہیں، بعض سائنس اور فزکس کے۔ بعض نے ریاضی کو احساس فکر بنایا ہے اور اپنے بیان کو ایسا پیچیدہ اور خشک کر دیا ہے کہ بہت کم لوگ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بعض نے گمان کو حقیقت سمجھا ہے اور تخیل و گمان کے میدان میں چاروں طرف گھوڑے دوڑائے ہیں اور اصل نقطہ نظر پر قائم نہیں رہے۔ لیکن افلاطون نے ان سب کو آپس میں سمو دیا ہے کیونکہ وہ مفکر بھی ہے اور شاعر بھی۔ اس کی طبیعت میں موسیقی ہے۔ وہ موسیقی دان ہے۔

افلاطون حسن کو ہر چیز میں دیکھتا ہے۔ مصور اور ادیب بے مثل ہے۔ ریاضی دان ہے۔ موقع پر تخیل پسند اور صوفی بھی بن جاتا ہے اور عین دنیا داری میں معرفت کی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ اس نے سلف کے افکار کا مطالعہ کیا۔ ان میں اختلاف دیکھے اور انہیں ملا کر ایک کیا اور ایسی عبارت میں پیش کیا کہ ان میں کشش شعر، حسن ادب، توازن موسیقی، استدلال منطقی، صحت ریاضی، اور رموز معرفت نظر آتے ہیں۔

افلاطون آئیڈیالوجی قسم کا مفکر ہے۔ اس کی آئیڈیالوجی یورپ کی سیاسی، اجتماعی، ملی اور روحانی بنیاد ہے۔ وہ انسان کی دو حقیقتیں بتاتا ہے۔

- حقیقت باطن جو تمام حقائق کا سرچشمہ، یگانہ، بے نقص اور خیر محض ہے۔
- ہر انسان کا فرض ہے کہ انصاف اور صداقت کے ذریعہ اس حقیقت کو حاصل کرے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے افکار فلسفیانہ ہیں، لیکن زبان شاعرانہ اور ادیبانہ ہے۔ اس کا فلسفہ سلف کے افکار پر تبصرہ، انتقاد اور امتزاج ہے، مثلاً اس نے دیکھا کہ فیثاغورث اعداد کو بے حد اہمیت دیتا ہے اور انہیں ہر چیز کی علت قرار دیتا ہے۔ ہرکلیتوس کائنات کو

بے سکون اور متغیر سمجھتا ہے۔ اسی لئے ہر ایک چیز ناپائیدار ہے اور ایک ہی صورت میں نہیں رہتی۔ اس کے برعکس ہرمیندس سکون کا مدعی ہے۔ تغیر کو مطلق نہیں مانتا۔ امپدوکلیس انسان کو بہت سی حالتوں میں گزارتا ہے۔ دیموکریتوس ذرات کو لاتجزیٰ کہتا ہے۔ اس کے نزدیک سب کچھ ذرات سے مرکب ہے جو کبھی مل جاتے ہیں اور کبھی جدا ہو جاتے ہیں۔ انہیں کی جدائی اور ملاپ سے کائنات وجود پذیر ہوتی ہے۔

افلاطون نے ان آراء کو سوچا اور ایک باغبان کی طرح جو مختلف قسم و رنگ کے پودے ملا کر ایک چمن آراستہ کر دیتا ہے، ان افکار کو منظم کیا۔ حرکت و تغیر کو بھی قبول کیا اور فیثا غورث کے اعداد و عرفان کو بھی رد نہ کیا اور دیموکراتیس کے دلائل کی بھی تردید نہ کی اور ایسی بات کہی کہ سب اس میں سما گئے۔

اس کی بیشتر تصانیف تمثیل و مکالمہ کی صورت میں ہیں۔ اس زمانہ میں یہ انداز ہندو ایران میں بھی مروج تھا اور اس سے غرض یہ تھی کہ بیان زیادہ واضح اور مجسم بنایا جائے۔ سقراط اس کا پہلا استاد ہے جسے اس نے صدر کی جگہ پر بٹھایا ہے۔ وہی ابتدا کرنے والا، سوال کرنے والا اور انجام کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کے بعد ہرمیندس، الکیادس، ہیورتس، ایوائی دیموس، پروتا غورث، گورگیاس، پولس وغیرہ مفکر ہیں، جن میں سے حقیقی بھی ہیں اور خیالی بھی۔ وہ ان سب کو بزم خیال میں لاتا ہے اور گفتگو کرتا ہے اور اکثر اوقات نتیجہ پر پہنچتا ہے اور کبھی یہ مکالمہ ادھورا رہتا ہے، یا سقراط کی تقریر پر ختم ہو جاتا ہے۔ سوالات کی نوعیت مابعد الطبیعات، منطق، سیاست، تہذیب الاخلاق، حسن، موسیقی، طرز تعلیم، ادب وغیرہ وغیرہ کی ہوتی ہے۔ پڑھنے والا جب تک افکار کو ملا کر جدا نہ کرے مطلب سے بے بہرہ رہتا ہے، کیونکہ ظاہری طور پر بعض افکار مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ غور سے سوچیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تنقید صحیح اور عمل درست ہے۔ اس کی تصنیف کا مطالعہ کرنے والا دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا، یا تو ادیب ہوتا ہے یا فلسفی، اگر وہ صرف

ادیب ہے تو افلاطون کی عبارت اس کے لیے گل وریحان ادب کا ایک باغ ہے، اگر فلسفی ہے تو اس کے افکار گونا گوں میں وحدت پاتا ہے۔

افلاطون کے افکار میں مسائل مابعد الطبیعات، معرفت، اخلاق، سیاست اور ادب باہم مرکب ہیں، مصنف خود دوسروں کے نام سے سوالات کرتا ہے اور دوسروں کے نام سے جواب دیتا ہے۔

اس کا پہلا سوال یہ ہے کہ انسان کیسے بہتر اور کامل ہوسکتا ہے؟ اس کے وسائل اچھے ہونے کا کیا مطلب ہے؟ وہ ان سے متعلق بحث کرتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ظاہر و باطن پاک ہو تاکہ افراد پاک سوسائٹی کی تشکیل کرسکیں۔ اس بحث کو اس نے اپنی کتاب جمہوریت (Republic) میں مفصل بیان کیا ہے۔

مذکورہ کتاب میں تین اہم نکات بیان کیے گیے ہیں:

- عدل کیا ہے؟
- بہترین تعلیم وتربیت کیسے ہوسکتی ہے؟
- نظام معیشت کی بنیاد کیا ہونی چاہیے؟

ان نکات کی توضیح کے لیے ایک دولت مند بنام کیفالوس (Cefhalus) کے گھر میں محفل منعقد ہوتی ہے۔ یاران جلسہ انجمن بنتے ہیں۔ سقراط بحث کا آغاز کرتا ہے۔ چونکہ محفل میں ایک امیر آدمی موجود ہے اس لیے اس کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

"کیا آپ مال وزر کی فراہمی میں بہترین سعادت خیال کرتے ہیں؟ کیفالوس کہتا ہے کہ تونگری انسان کو سخی، امین، عادل بناتی ہے اس لحاظ سے بہترین سعادت ہے۔

سقراط پوچھتا ہے۔ عدل سے آپ کا مقصود کیا ہے؟

اس سوال پر ایک لمبی بحث شروع ہوجاتی ہے۔ ایک کہتا ہے عدل ایک طاقت ہے

اور عدالت طاقتور کے لیے۔ حاکموں کے قوانین درحقیقت ان کے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ قانون کے ذریعے چاہتے ہیں کہ فرمانبردار حکم بجالائے اور ان کی خواہش کے مطابق عمل کرے۔ جو اطاعت کرے، وہ درستکار اور متقین کا خادم ہے اور جو نہ کرے، وہ ان کا گنہگار اور مردود ہے۔

یہ عقیدہ کہ طاقت ہی صداقت ہے، نٹشے جیسے فلسفی کے فکر کی اساس ہوا بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ اقوام فرنگ کی استعماریت اور سیاست کی بنیاد ہے۔ موسیو سٹرنر (Sterner) کے قول کے مطابق کہ "مٹھی بھر طاقت، حقانیت سے بھری ہوئی جیب سے بہتر ہے" عدل فضیلت ہے لیکن کمزور اور ناتواں کے لیے نہیں، بلکہ اس کے لیے جسے ہوش، شجاعت اور طاقت حاصل ہے۔"

پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالت کا مقصد خیر ہے یا توانائی؟ جواب میں سقراط کہتا ہے کہ عدالت، سوسائٹی کے افراد کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے تاکہ وہ سوسائٹی کو منظم اور پاک بنائے۔ شیخ سعدی کا بھی یہی خیال ہے کہ افراد کو سوسائٹی کے لیے زندگی وقف کردینی چاہیے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنت دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہادند آدمی

پس سوسائٹی کے افراد میں عدل کا قیام نہایت ضروری ہے۔ یہیں سے سوسائٹی اور افراد سے متعلق بحث کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مناظر ڈیموکریسی کی طرف داری کرتے

ہیں کہ ڈیموکریسی بہترین چیز ہے۔ لیکن جب تک سوسائٹی کے افراد روحانیت و تربیت کے بلند مرتبہ کو نہ پہنچیں خوشحالی اور امن کی بجائے بدحالی اور بے چینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ پارٹی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ شخصی امور سے گزر کر حکومت پر توجہ دے اور نہ اتنی استعداد اور ہوش کہ حکومت کے کاموں کے لیے بہترین کارکن منتخب کر سکے۔ نتیجتاً عام طور پر نااہل کارکن منتخب ہو جاتے ہیں اور فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اجتماعی زندگی متلاطم دریا کی طرح بن جاتی ہے، جس کی لہریں درہم برہم ہو کر سوسائٹی کی کشتی کو متحرک کر دیتی ہیں اور آخر قعر دریا میں لے جاتی ہیں۔ اگر ڈیموکریسی کا نتیجہ ڈکٹیٹر شپ ہو تو بات سیاست سے معرفت میں چلی جاتی ہے اور انسان ایسے ذہن کے متعلق سوچتا ہے، کیونکہ اندرونی افکار بیرونی اعمال کی علت ہوتے ہیں اور بیرونی اعمال افراد سے سوسائٹی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر افراد کی سمجھ ناقص ہو، تو ناقص سوسائٹی پیدا ہوتی ہے۔ پس صحیح سوسائٹی کی تشکیل سے پہلے افراد کے اذہان کو صحیح کارکن بننا چاہیے۔ افلاطون کہتا ہے کہ انسان کے اعمال تین سرچشموں سے پھوٹتے ہیں۔

- عقل جس کا مرکز صحیح تصور ہے۔
- دماغ کی قوت جس کا مرکز دل ہے۔
- پیٹ کی شہوت۔

فلسفہ سانکھیہ کے تینوں عناصر ستوہ، رجس اور تمس کی مانند افلاطون کے ہاں بھی تین ایسی قوتیں ہیں جو تمام انسانوں میں سرگرم عمل ہیں۔ ایک میں عقل غالب ہے۔ دوسری دفاع جس سے شجاعت اور جلال ظاہر ہوتا ہے۔ تیسری خواہش شہوانی ہے۔ جس شخص میں ان تینوں میں سے جس کا غلبہ ہو وہ اسی طرف راغب ہوتا ہے۔ اگر کسی میں عقل طاقتور اور دونوں دوسری قوتیں نسبتاً کمزور ہوں تو وہ روحانیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی میں قوت دفاع غالب ہے تو وہ ان امور کی طرف مائل ہوتا ہے، جن میں

غلبہ اور شجاعت کی ضرورت ہو، اگر کسی میں خواہش شہوانی غالب ہو، تو وہ عیاشی، خوردونوش، آرام طلبی اور ثروت اندوزی میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا ہے۔

شہوت پرست ہمیشہ مضطرب رہتا ہے، کیونکہ وہ مادیات میں مستغرق ہے۔ اس کا مقصد شہوت رانی اور نمائش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ قناعت سے کوسوں دور رہتا ہے، اگر ایسا آدمی سوداگر یا سرمایہ دار ہو جائے تو ممکن ہے سوسائٹی کی خدمت کرے۔ شجاع کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ میدان رزم گرم ہو اور وہ اس میں فتح مندی حاصل کرے۔ ایسا آدمی ملک کی حفاظت اور کمزور کی حمایت کے لیے موزوں ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے مرتبہ کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو غور وفکر کا مالک ہے، پاکبازی کا خواہاں ہے دولت اور فتح کی پروا نہیں کرتا اور اس کے افکار پہلے دونوں کی طرح آتشیں نہیں بلکہ نور ہیں، وہ اس قابل ہے کہ پہلے دونوں کا نگراں ہو اور نظم وترتیب اور اعتدال پیدا کر کے سوسائٹی پر حکومت کرے۔

شہوت پرست کے لیے زر وسیم نعمت ہے۔ شجاع کے لیے رزم دلی مدعا ہے لیکن ایک مفکر کے لیے راستی اور صدق بہشت ہیں۔ وہ اپنے افکار وعقل دوسروں کو عطا کرتا ہے اور دوسرے اسے مصائب معیشت سے نجات دلاتے ہیں۔ عدل کا یہ مقصد ہے کہ ہر شخص اپنا فرض بجالائے، تاکہ سوسائٹی میں عدل وتوازن پیدا ہو، یعنی کاشتکار، کاشت کاری کا فرض ادا کرے تاکہ اس کے ذریعہ سوسائٹی کی خدمت بجالائے اور سوداگر تجارت کرے، فوجی کمر میں تلوار باندھے اور ملک کا دفاع کر کے کمزوروں کی مدد کرے۔ اسی طرح مفکر پاکیزگی اور نیکی کا مجسمہ بن جاتا ہے، تاکہ وہ دوسروں کے لیے اخلاق کا بہترین نمونہ بن جائے۔

اس ترتیب سے ہر شخص دوسروں کیلئے جیتا ہے اور اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ نتیجۃً ایسی سوسائٹی تشکیل پاتی ہے، جسے معاشرۂ عدل کہہ سکتے ہیں۔

اسی طرح اگر قوائے سہ گانہ یعنی عقل، غضب اور شہوت درست کام کریں یعنی غضب و شہوت عقل کے تابع ہو جائیں، تو ایسا شخص قابلِ تعریف ہوگا۔ پس عدالت کسی شخص میں توازن و موافقت قوت سہ گانہ کا نام ہے اور معاشرہ میں عدل کے یہ معنی ہیں کہ معاشرہ کے افراد میں یک جہتی اور ہم آہنگی ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ امر اختیاری ہے یا انسان کی قوت حدود سے باہر ہے؟ افلاطون کہتا ہے کہ صحیح تربیت سے ایسا ممکن ہے، اگر معاشرہ کے تمام افراد نہیں، تو زیادہ تر طبعی نواقص سے پاک ہو جائیں گے۔ لہٰذا اب سوال طریقہ تعلیم کا رہ جاتا ہے۔

افلاطون کی رائے کے مطابق بچوں کی تعلیم دس سال کی عمر میں شروع ہونی چاہیے کیونکہ دس سال سے بیس سال تک کا عرصہ نشو ونما کا ہے۔ لہٰذا بچوں کو ورزش جسمانی میں مشغول رکھنا چاہیے، تاکہ ان کے بدن توانا اور اعضائے رئیسہ قوی ہو جائیں اور درست کام کریں۔ لیکن ایک ہی طرح کی ورزش ان میں خشونت پیدا کرتی ہے، اس لیے ورزش کے ساتھ موسیقی بھی چاہیے، کیونکہ موسیقی توازن و شائستگی پیدا کرتی ہے اور صحت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ موسیقی بھی خطرہ سے خالی نہیں، جیسا کہ صرف ورزش خشونت اور حیوانیت پر مائل کرتی ہے، موسیقی زیادہ ملائم اور نرم کر دیتی ہے اور مشکل کاموں کی انجام دہی سے روکتی ہے۔ لہٰذا دونوں میں اندازہ معین ہونا چاہیے۔

جب بچہ سولہ سال کا ہو جائے تو موسیقی کافی ہے، مگر یہ کہ کبھی کبھی تفریحی شغل کے طور پر ہو۔ ضمناً اسے ریاضی، تاریخ اور دیگر علوم سے بھی آگاہ کیا جائے، لیکن تعلیم جبری نہ ہو، بلکہ سبق کو آسان اور دلچسپ بنا کر پیش کیا جائے، کیونکہ جو علم جلدی پڑھایا جائے، جلدی ہی بھول بھی جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے تہذیبِ اخلاق پر مائل کیا جائے۔ جو اس کو سمجھائیں کہ وہ معاشرہ کا ایک ممبر ہے۔ اسے دوسروں کی مدد کرنی چاہیے ورنہ وہ دوسروں کے لیے مصیبت کا باعث بن جائے گا۔ چونکہ انسان بالطبع، حاسد حریص، جدال

پسنداور شہوت پرست ہے اس لیے اسے کسی مذہب اور اصول کی طرف رہنمائی کرنی چاہیے، تا کہ اس کے اثر سے صفات ذمیمہ وحیوانی نرم اور مختصر ہو جائیں۔

افلاطون کا خیال ہے کہ خدا کو نہ ماننے والی قوم طاقتور نہیں ہوتی کیونکہ خدا کا عقیدہ اسے ایک آنے والی زندگی کا امیدوار بناتا ہے اور اس میں نیک اعمال کے لیے ہمت پیدا کرتا ہے۔ اس عقیدہ کا انسان موت کو ہنسی، خوشی قبول کرتا ہے اور دوستوں اور عزیزوں کی موت پر صبر کرتا ہے۔

اس ترتیب اور تربیت سے جب وہ بیس سال کا ہو جائے تو اس کا امتحان لیا جائے اور اسے استعداد اور رغبت کے لحاظ سے کسی کام پر متعین کیا جائے۔ جو بچے عقل سیکھنے اور پاک زندگی بسر کرنے کی استعداد رکھتے ہوں انہیں منتخب کر کے اور دس سال تک مخصوص علوم سکھائیں اور پھر تیس سال کی عمر میں ان کا امتحان لیا جائے، تا کہ وہ آزمائش سے گزر کر زیادہ سخت ہو جائیں۔ جو جوان اس آزمائش میں کامیاب ہو جائیں، انہیں اور پانچ سال تک حکمت و فلسفہ پڑھائیں۔ خاص کر انہیں مفہوم فہمی کی تعلم دیں، کہ وہ کیونکر درست سوچیں اور مادیات و محسوسات سے نکل کر مجردات اور مفعولات تک پہنچیں اور کیونکر دانش مندانہ حکومت کریں۔

فکر کے متعلق کہتا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

- تفکر کلیات۔
- تفکر جزئیات۔

لیکن کل کا فکر جزو کے فکر سے زیادہ اہم ہے، مثلاً یہ تفکر کہ انسان کیا ہے، اس تفکر سے کہ احمد کون ہے، زیادہ اہم ہے۔ یا اس قوت کا تفکر جو نباتات میں علت نشو ونما ہے، درخت معین کے تفکر سے زیادہ اہم ہے۔

جب پانچ سال تک طرز فکر کی تربیت ہو جائے، اور مفہوم تک رسائی حاصل ہو، تو

ایسا جوان ۳۵ سال کی عمر میں حاکم بن سکتا ہے، بشرطیکہ اپنے آپ کو فراموش کر کے قوم کے لیے زندگی وقف کر دے، یعنی اپنے لیے نہ تو دولت پیدا کرنے کا خواہاں ہو نہ جاگیر کا طالب۔ نہ اسے بیوی کی پروا ہو نہ اولاد کی خواہش، بلکہ سپاہیوں کی طرح اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھائے پیئے اور اٹھے بیٹھے۔ زندگی کی ضروریات میں قناعت کرے۔ اہل وطن اسے اتنا دیں کہ وہ ایک سال تک زندگی بے فکری سے بسر کر سکے۔

سیم وزر گھٹیا لوگوں کا مقصود ہوتا ہے۔ حاکموں کو خدا سے رحمت اور بخشش کی طلب کرنی چاہیے۔ جب کوئی حاکم زر و سیم کا طالب ہو، تو اسے حاکموں کے گروہ سے الگ کر دینا چاہیے، تاکہ وہ دولت پرست طبقہ میں زندگی بسر کرے۔ حاکم مقررہ بیوی نہیں رکھے گا، بلکہ خوراک اور گھر کی طرح ان میں عورتیں مشترک اور اولاد نامعلوم ہوگی اور تمام مائیں بچوں کی تربیت میں مشغول رہیں گی۔

یہ عجیب ترتیب حاکم طبقہ کے لئے مخصوص ہے۔ ادنی طبقہ مقررہ بیوی اور اولاد رکھیں گے اور ایسی زندگی کے عادی رہیں گے۔

اس لحاظ سے افلاطون کی اشتراکیت موجودہ اشتراکیت نہیں کیونکہ یہ صرف حکمران طبقہ اور فوج سے مخصوص اور انہیں میں محدود ہے۔ طبقہ سوم مکمل طور پر مستثنیٰ ہے اور ان میں دولت محدود نہیں۔ پس افلاطون کی اشتراکیت دونوں بلند طبقوں کے استبداد و قوت کی روک تھام اور اعتدال کے لیے ہے۔ ایک نقطہ نظر سے اسے موجودہ اشتراکیت کا عکس کہہ سکتے ہیں، یعنی موجودہ اشتراکیت میں حکمران طبقہ تمام مال و دولت کو جمع کرتا ہے اور تقسیم کر دیتا ہے، لیکن افلاطونی اشتراکیت میں تمام دولت طبقہ سوم کے ہاں جمع ہو کر رفع احتیاج کے لیے دونوں اونچے طبقوں کو ایک اندازہ سے دی جاتی ہے۔

حقوق زن و مرد کے متعلق افلاطون کا عقیدہ تھا کہ یہ حقوق مساویانہ ہونے چاہئیں، بلکہ مردوں کے مخصوص کاموں کے لیے عورتوں کو تیاری کرنی چاہیے، تاکہ وہ بھی

انہیں انجام دے سکیں۔

شادی سے پہلے آزمائش کرنی چاہیے کہ میاں بیوی تندرست ہیں۔ اگر ان کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو معاشرہ میں ایک تندرست کا اضافہ ہوگا۔ اس لیے وہ کتاب نوامیس میں کہتا ہے کہ پیدائش سے پہلے بچے کی تربیت ہونی چاہیے، اگر ناقص، ناتواں اور بیمار بچہ پیدا ہو، تو بہتر یہ ہے کہ اسے ایسی جگہ رکھیں کہ مر جائے۔

یہ خیال آریاؤں میں بھی تھا اور ایرانیوں میں بھی اور اس کا اثر زال کے افسانہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ زال کے باپ سام نے اسے ناقص اور بیمار سمجھتے ہوئے دور پھینک دیا تھا۔

افلاطون کی رائے میں ناقص نا مولود ناقص کام کرتا ہے اور اس پر تربیت کا اثر نہیں ہوتا اور اگر ہو تو کم ہوتا ہے۔

مرد کے لیے شادی کا زمانہ تیس سے بتالیس سال کا درمیانی عرصہ ہے اور عورت کی شادی کا وقت بیس سے چالیس سال کا درمیانی عرصہ ہے، اگر مرد نے پچیس سال تک شادی نہیں کی تو لازمی ہے کہ وہ دولت کی طرف راغب ہو جائے۔ مرد کو پچتالیس سال کے بعد اور عورت کو چالیس سال کے بعد صاحب اولاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

رشتہ داروں میں شادی جیسا کہ مصر، ایشیائے کوچک اور ایران میں رواج ہے، افلاطون کے رائے کے مطابق نہیں۔ وہ ایسی شادیوں سے روکتا ہے اور کہتا ہے کہ قریبی رشتہ داروں میں شادی درست نہیں۔ افلاطونی معاشرہ اس ترتیب سے تشکیل پاتا ہے کہ دانش مند اور صحیح الاعضاء لوگ جو بالطبع محدود ہوتے ہیں حاکم ہوں اور نسبتاً زیادہ تعداد فوجی اور محافظ وطن لوگوں کی ہو، اس سے زیادہ طبقہ تاجر اور کاشتکار ہوں، جو پہلے دو گروہوں کی ضروریات فراہم کریں۔

ہندو ایران میں بھی ایسی ہی طبقاتی تقسیم موجود ہے۔ ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے

کہ ان دونوں کا فکر جمہوریہ افلاطون سے زیادہ وسیع تھا۔ ہندوستان میں معاشرہ تین طبقوں کی بجائے چار بلکہ پانچ طبقوں میں بہ ترتیب ذیل تقسیم تھا۔

راہنما☆

برہمن۔ جن کا فرض تحصیل علم و عقل تھا۔ جب برہمن بچہ دس یا بارہ سال کا ہوتا تھا، تو اس کا باپ اسے کسی عالم کے پاس تحصیل علم کے لیے چھوڑ دیتا تھا۔ استاد اسے علم و اخلاق کی تعلیم دیتا تھا، یہاں تک کہ اسے ہر طرح سے تربیت دے کر معاشرہ کا ممبر بننے کی اجازت عطا کرتا تھا۔

فوجی☆

کشتری یا کھتری۔ یہ فوجی گروہ تھا۔ اس کی تربیت کا طریق اور تھا۔ اکثر اوقات اس کا استاد برہمن ہوتا تھا، جو اسے سواری اور آلات جنگ کا استعمال سکھاتا تھا۔ کھتری کے لئے وعدہ کا ایفا لازمی تھا اور وہ پہلے گروہ کا محافظ ہو کر مردانہ وار زندگی بسر کرتا تھا۔

پیشہ کار تاجر☆

ویش۔ یہ لوگ تاجر اور کاشتکار تھے۔ ان کی تربیت بھی مخصوص تھی۔ یہ برہمن اور کھتری کے ہم مرتبہ نہ تھے اور اپنے کام کے لحاظ سے تربیت حاصل کرتے تھے۔

مزدور☆

شودر۔ یہ مزدور اور خادم ہوتے تھے۔

کمی کمین☆

نیچ۔ یہ نہایت ادنیٰ کام کرتے تھے اور ان کے لیے علم کی تدریس کی قطعاً ممانعت تھی۔

ایران میں بھی چار طبقے تھے، جیسا کہ فردوسی کے شاہنامہ سے ظاہر ہے:

زہر پیشہ ور انجمن گرد کرد

بدین اندروں سال پنجاہ خورد
گروہے کہ کاتو زیاں خوانیش
برسم پرستندگاں دانیش
جدا کرد شاں از میان گروہ
پرستندہ را جا یگہ کرد کوہ
بداں تا پرستش بود کار شاں
نواں پیش روشن جہاندار شاں
صفے مر دگر دست بنشاندند
ہمے نام پنساریاں خواندند
کجا شیر مردان جنگ آورند
فروزندۂ لشکر و کشورند
نسودی سہ دیگر گرہ را شناس
کجا نیست برکس ازایشاں سپاس
بکارند و دوزند و خود بدروند
بگاہ خورش سرزنش نشنوند
ز فرمان سر آزادہ خوذ ژندہ پوش
ز آوازہ پیغارہ آسودہ گوش
چہارم کہ خوانند اہنو خوشی
ہماں دست ورزان بر سر کشی
کجا کارشاں ہمگناں پیشہ بود
رواں شاں ہمیشہ پراندیشہ بود

ایران میں ہر گروہ کی تربیت علیحدہ علیحدہ مخصوص تھی۔ ایک نکتہ جو افلاطونی جمہوریہ کو ایران و ہند کے معاشرہ پر ترجیح دیتا ہےیہ ہے کہ یونانی معاشرہ میں ابتداً تربیت مشترک تھی اور اس کے بعد استعداد کی بنا پر تدریجاً انتخاب ہوتا تھا، تا کہ قابل لوگ اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں۔

افلاطون کی رائے کے مطابق معاشرہ کے بہترین لوگوں کو حاکم ہونا چاہیے، لیکن ہند و ایران میں بہترین لوگ معاشرہ کے امور سے جدا ہو کر، پوجا پاٹ اور تزکیہ نفس میں محو رہتے ہیں۔

افلاطون کے نظریہ کے مطابق مرد و عورت بیس سال کی عمر کے بعد شادی کے رشتوں میں بندھنے کے قابل ہوتے ہیں، تا کہ تندرست آدمیوں کا معاشرہ میں اضافہ ہو۔

ہندوستان میں کوئی ایسی قید نہیں تھی، بلکہ دونوں ملکوں میں یہ خواہش تھی کہ ان کے بچے اور بچیاں عنفوان شباب میں شادی کریں۔ ہندوستان میں روحانی طبقہ گوشت سے پرہیز کرتا تھا، لیکن فوجی لوگ جو چاہتے تھے کھاتے تھے، بلکہ اپنے وقت کا ایک حصہ شکار میں گزارتے تھے۔ برہمن فوجی فنون سے نہ صرف آگاہ ہوتے تھے بلکہ استادی بھی انہیں کے حصہ میں تھی، لیکن ان کا کام علم سکھانا تھا۔ وہ خود فوج میں شامل نہیں ہوتے تھے۔

افلاطون کے اصول کے مطابق تاجروں کو تھوڑے منافع پر قانع ہونا چاہیے۔ عادل انسان وہ ہوتا ہے جو اپنے کام کو درست طور پر انجام دے اور فرض کا حق ادا کرے۔

ہندی مفکروں کا بھی ایسا ہی خیال تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہر کام "دھرم" یعنی دین اور فرض ہے، اس لیے ہر کام کو صحیح نیت سے سرانجام دینا چاہیے۔ جب افراد معاشرہ کا ہر فرد اپنے فرض کو صحیح طور پر ادا کرے، معاشرہ کی پوری رفاقت کرے، تو ایسا معاشرہ گویا ایسا ساز ہے جس کے تار ہم آہنگ ہو کر دلکش آواز پیدا کرتے ہیں۔ اس سے ماحول پاک اور

قابل ستائش وجود میں آتا ہے۔

پس افلاطون کا عدل توازن ہم آہنگی کا دوسرا نام ہے۔ وہ معاشرہ جس میں اتحاد اور ہم آہنگی نہ ہو، وہ آخرکار کمزور ہو کر مٹ جاتا ہے۔

عدالت تو طاقت، توازن اور نظم کا نام ہے۔ جس نے نظم اور حسن کو حقیقی معنوں میں سمجھ لیا، وہی عادل ہے۔ عدالت انسان میں شجاعت اور حکمت وعفت پیدا کرتی ہے۔ اسے مہذب اور با اخلاق بناتی ہے۔ البتہ مفکرین نے اخلاق کی تعریف اپنے سلیقہ کے مطابق کی ہے۔ حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں "کمزوروں کی مدد اوران کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا اخلاق ہے۔" لیکن نٹشے کہتا ہے کہ دلیری اور شہامت کا نام اخلاق ہے۔ افلاطون اتحاد اور ہم آہنگی کو اخلاق سمجھتا ہے۔

افلاطون کے افکار نے ایشیاء اور یورپ میں عموماً اور یورپین معاشرہ میں خصوصاً گہرا اثر پیدا کیا ہے۔ یورپ کی ہر انجمن نے خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی سیاست افلاطون کا کوئی نہ کوئی نقطہ ضرور لیا ہے اور اسے سلیقہ کے مطابق ڈھال لیا ہے، مثلاً کیتھولک کلیساؤں کی ترتیب افلاطون سے لی گئی ہے، حتیٰ کہ مفکرین کی بجائے روحانی پادریوں کو اپنا حاکم تسلیم کیا ہے، کیونکہ وہ سادہ زندگی گزارتے ہیں، اپنے لیے کوئی جمع جتھا نہیں رکھتے اور اپنی تمام عمر معاشرہ کے اخلاق کی اصلاح میں گزار دیتے ہیں اور دنیا کو ترک کر دیتے ہیں۔

اگرچہ ڈیموکریسی حکومت افلاطونی اصول کے مطابق نہیں لیکن عملاً انگلستان میں ایسے لوگ حاکم بنے ہیں جنہوں نے عرصہ دراز تک اپنے ملک کی خدمت کر کے تجربات حاصل کیے ہوں اور قوم کو ان پر اعتماد ہو۔ یہی اصول اشتراکی، نازی اور فاسسٹ ممالک کا ہے۔

مشرق میں فلسفہ افلاطون حکمت کے نام سے محدود ہو کر رہ گیا اسی لیے چند مفکرین

کے علاوہ اس سے کسی نے استفادہ نہیں کیا اور اصول حکمرانی جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ البتہ مزدک افلاطونی افکار سے متاثر ہوا اور اس نے افلاطون کی آئیڈیالوجی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کرنی چاہی، لیکن ایرانی قوم نے اسے نہ مانا۔ اس کے نام سے فقط اشتراکیت منسوب ہوئی۔ اب تک ایران میں کوئی صحیح طور سے نہیں جانتا کہ اس کا مقصد کیا تھا اور وہ کیا چاہتا تھا۔

جس طرح انسان میں حکمت، غضب اور شہوت تین قوتیں ہیں اور معاشرہ تین طبقوں میں تقسیم ہوتا ہے، اسی طرح افلاطونی عقیدہ میں وجود کی بھی تین قسمیں ہیں۔

1- نفسانی خواہشات میں مستغرق انسان سب سے زیادہ پست ہے۔

2- اس سے اونچی وہ قسم ہے، جو محسوسات کو مصور و مجسم کرتی ہے۔

3- اور سب سے بلند وہ قسم ہے، جس کے ماتحت مذکورہ دونوں قوتیں ہیں۔

حقائق ثابتہ تغیر پذیر نہیں ہوتے۔ افلاطون نے تحرک و تبدل کے عقیدہ کی اصلاح کی کہ دنیا ناپائیدار اور متغیر ہے، اس کی تمام چیزیں ناپائیدار ہیں۔ لیکن ایک ایسا عالم بھی ہے، جس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور وہ حقائق ثابتہ کا عالم ہے، افلاطون نے اسے (Eidos) کہا ہے۔ پس انسانی عقل کے بھی تین مدارج ہیں۔

- اشیائے محسوس کا علم۔
- صور ذہنیہ۔
- حقائق ثابتہ

افلاطون کے نزدیک حقائق ثابتہ کی حقیقت جاننا ہی علم حقیقی ہے۔ جو علم ہم محسوسات سے حاصل کرتے ہیں، جیسے محسوسات ناپائیدار ہیں وہ بھی ناپائدار ہے۔ اسی طرح حسن کی بھی دو قسمیں ہیں۔

1- جو کچھ محسوسات سے حسین نظر آتا ہے، عارضی ہے اور ناپائدار ہے۔

2- جو کچھ حقائق میں ہے، وہ پائندہ ہے اور قابل توجہ ہے۔ جو مفکر حکمران بنیں انہیں چاہیے کہ حقیقت صور کو سمجھیں تا کہ جمہوری عدل کا مفہوم معلوم ہو۔ انہیں معقولات کی دنیا میں بھی صحیح اور مکمل ہونا چاہیے۔ جتنا کوئی حقائق ثابتہ کو سمجھتا ہے وہ اتنا ہی خیر محض کے قریب پہنچ جاتا ہے اور سعادت جاوید حاصل کرتا ہے۔

افلاطون مادہ کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ اسے ''نازیبا'' کہتا ہے اور عالم محسوس کو اس سے برتر مانتا ہے۔ جب حسن، بدصورتی پر جلوہ فگن ہوتا ہے، سورج کی شعاع کی طرح بدصورتی کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ لیکن جب شعاع اس سے منقطع ہوتی ہے، بدصورتی اپنی جگہ پر آ موجود ہوتی ہے۔ مادہ بالقوہ ہے بالفعل نہیں ہے۔ اس لیے عالم محسوس کا مستقل وجود نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سایہ ہے۔ انسان کو سایہ سے اصل کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ مولانا روم کہتے ہیں:

ایں عرضہا از چہ زائید از صور
ویں صور ہم از چہ زائید از فکر
ایں جہاں یک فکرت است از عقل کل
عقل چوں شاہ است و فکرتہا رسل
غیب را ابرے و آبے دیگر است
آسمان و آفتابے دیگر است

پس جس قدر جذبہ مادی وحس میں کمی ہوگی، اتنی ہی جذبہ تجرد میں ترقی ہوگی یعنی حقائق ثابتہ سے قرب ہوگا حتیٰ کہ مادیات کا پردہ بالکل اٹھ جائے گا اور مجرد محض رہ جائے گا اور انسان عالم تغیر وتبدل سے نکل کر عالم سکون میں پہنچ جائے گا۔ جس طرح محسوسات حواس پنجگانہ وحس مشترک کے ذریعہ محسوس ہوتے ہیں اسی طرح عقل کے واسطے سے ممیز، معقولات بھی حواس مخصوص کے ذریعے سے سمجھے جاتے ہیں۔

پنج حسے است جز ایں پنج حس

آن چو زر سرخ و ایں حس ہا چومس

حقائق ثابتہ حدودوزماں ومکان سے بے نیاز ہیں اور علم الٰہی میں غیر فانی ہیں۔

افلاطون نے پچاس سال تعلیم وتدریس میں گزارے۔ ۲۷ سے ۳۵ مکالمات تک اور تیرہ خطوط اس کی یادگار ہیں۔ بعض خطوط بہ ترتیب ذیل ہیں۔

- (Republic) جمہوریت یا سیاست۔
- (Laws) نوامیس یا قوانین۔
- (Timoes) تیماوس۔
- (Sophist) سوفسط یا سوفسطائیت۔
- (Phaedos) فیدوس۔
- کراتولیس۔
- گرگیاس۔
- ہرمیندس۔
- پروتاغورث۔
- فدروس (حسن)

نوامیس و تیاوس کا عربی ترجمہ اصل مکتوب سے نہیں ہوا بلکہ جالینوس کی شرح سے کیا گیا ہے۔

افلاطون نے مشرق میں اس طرح مقبولیت حاصل کی کہ بعض دوسری کتب بھی اس کے نام سے مشہور ہوگئیں، جیسے مابعد الطبیعات یا الٰہیات افلاطون۔

مختصر طور پر بیان کیا جا چکا ہے کہ افلاطون کی عبارات شاعرانہ اور مرموز ہیں۔ عرفاء اسلام نے اسے گنج شائگاں تصور کیا اور مرموز کو زیادہ مرموز بنایا۔ خاص کر مولانا رومی نے

شاعری کے قالب میں ڈھال کر نور' علیٰ نور بنا دیا۔

عقیدہ افلاطون میں تمام جزئیات اپنے کلیات کی طرف جاتی ہیں اور کلیات وحدت (خیر محض) سے ظاہر ہوتی ہیں۔ سب اسی کی تلاش میں ہیں اور انسان بھی اسی کی تلاش میں بے قرار ہے وہ تمام اعیان میں ظہور کرتی ہے۔ تمام اشیاء اسی کی طرف رواں دواں ہیں۔ حقیقت جاوید بے شکل ہے۔ اعیان ثابتہ اصل ہیں اور اشیاء ان کی نقل۔ لیکن اصل، نقل سے جدا ہے۔ معقول و محسوس کا درمیانی واسطہ جان ہے، جو تحرک اور عقل کے ظہور کی علت ہے۔

افلاطون نے اپنی زندگی میں اپنی آئیڈیالوجی سیاست کو عملی رنگ میں دیکھنا چاہا، مگر یونان کو مناسب نہ جان کر سسلی چلا گیا، کیونکہ سسلی کے حاکم دیونیسوس (Dionysius) نے اسے دعوت دی تھی۔ افلاطون کا ایک دوست دیون نام وہاں تھا، جس سے اسے مدد کی امید تھی۔ شروع شروع میں دیونیسوس نے افلاطون کی بہت عزت کی لیکن اس کے افکار کو اپنی خواہشات کے مخالف پا کر سرد مہری کرنے لگا۔ کہتے ہیں کہ اس نے افلاطون کو قیرواں کے ایک مفکر کے ہاتھ فروخت کر دیا، جس نے خرید کر اسے آزاد کیا۔

افلاطون دیونیسوس کے بُرے سلوک سے پست ہمت نہ ہوا۔ جب اس کا بیٹا سسلی کے تخت پر بیٹھا، تو افلاطون پھر سسلی چلا گیا، لیکن اس دفعہ بھی پہلے کی طرح ناکام لوٹا۔ افلاطون تیسری بار پھر سسلی گیا تا کہ بادشاہ اور اپنے دوست دیون کے اختلاف کو دور کرے لیکن آخر بار بار کی ناکامی سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کی ایڈیالی سیاست اتنی بلند نہیں کہ اس پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ اس نے سیاست کو خیر باد کہا اور ایک اکیڈمی کی بنیاد ڈالی جو دو سال تک قائم رہی اور آخر ۵۲۹ ق۔م میں مٹ گئی۔

افلاطون نے اسی (۸۰) برس کی عمر پائی اور یہ سارا عرصہ تجارہ کر

ابنائے وطن کی تعلیم و تربیت میں صرف کر دیا۔ اپنی زندگی کی آخری رات اس نے اپنے شاگرد کے نکاح کی مجلس میں گزاری۔ دوستوں سے دل کھول کر باتیں کی۔ مجلس برخاست ہونے پر کرسی پر سو گیا۔ صبح ہوئی تو لوگ اسے جگانے آئے مگر وہ ابدی نیند سو چکا تھا، چنانچہ اسے نہایت عزت واحترام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

❄❄❄

ارسطو

ارسطو کے باپ کا نام نکوماخوس (Nicomachus) تھا جو ستاگرہ (Stagra) کا باشندہ تھا۔ ارسطو کی پیدائش ۳۸۷ ق۔م میں ہوئی۔ اس کا باپ سکندر کے دادا امینٹس (Amyntus) کا دوست تھا۔

جب ارسطو سترہ، اٹھارہ برس کا ہو گیا، تو اسے افلاطون کے مدرسہ میں بٹھایا گیا۔ جب تک افلاطون زندہ رہا، اس سے استفادہ کرتا رہا۔ افلاطون بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا اور اسے مدرسہ کی عقل کہتا تھا۔ چونکہ یہ دولت مند تھا اور کتابوں کا عاشق اس لیے اس نے اپنی لائبریری بنالی۔ یہ ایسا شاگرد تھا، جو اُستاد کے افکار کو سوچتا اور ان پر پوری توجہ دیتا تھا۔ مستقبل میں اسے استاد کے خیالات کے ساتھ اتفاق نہ رہا۔

جب افلاطون مر گیا، تو ارسطو ہرمیاس (Hermias) کے پاس چلا گیا اور تین سال تک وہاں قیام کیا۔ یہ شخص ارسطو کا شاگرد تھا اس نے استاد کی بہت آؤ بھگت کی اور اپنی بھانجی سے شادی کر دی۔ ۳۴۲ ق۔م میں فیلقوس نے اپنے بیٹے اسکندر کو اس کی شاگردی میں دے دیا۔ لیکن چونکہ اسکندر کا رجحان زیادہ تر سپاہیانہ کرتبوں کی طرف تھا، اس لیے فلسفہ کی تعلیم سے زیادہ متاثر نہ ہوا۔

فیلقوس کی موت کے بعد اسکندر تخت نشین ہوا اور جلدی ہی ایشیاء کی فتح کے لیے چلا گیا۔ اس کے بعد اُستاد و شاگرد کی ملاقات نہ ہو سکی۔ صرف خط و کتابت پر انحصار تھا۔

۵۳ سال کی عمر میں ارسطو نے اپنا مدرسہ جاری کیا، جو جلدی ہی افلاطونی اکیڈمی کی طرح شہرت سے ہمکنار ہو گیا۔ یہاں کے شاگرد اپنے استاد کی طرح منطقی اور طبیعی تھے۔ افلاطونی اور ارسطو کی اکیڈمی میں چشمک بھی پیدا ہو گئی، جس کی وجہ سے ارسطو نے استاد کے افکار کی تردید کی۔ چونکہ افلاطونی اکیڈمی کا حامی اپنے بانی کی شہرت کے سوا کوئی نہ تھا اور ارسطو شہنشاہ کا استاد مشہور تھا، اس لیے ارسطو کے مدرسہ کی بہت شہرت ہو گئی اور ہر طرف سے شاگردوں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ ان کا انتظام دشوار ہو گیا۔ ارسطو نے یہ دیکھ کر

حکم دیا کہ طلبہ ہر دسویں دن اپنے میں سے ایک ناظم منتخب کریں۔

طریق تدریس یہ تھا کہ استاد باغ میں چہل قدمی کرتا تھا، شاگرد اس کے ساتھ ساتھ پھرتے تھے، وہ تقریر کرتا جاتا تھا، طلبہ سوال کرتے تھے اور وہ انہیں جواب دیتا تھا۔ دوران تقریر میں استاد کو نئے نئے نکات سوجھتے۔ کیونکہ استاد کا بہترین استاد عقل مند شاگرد ہوتا ہے، جس کے عاقلانہ سوالات سے اس کے افکار میں ایک تحریک پیدا ہوتی ہے اور یہ تحریک استاد کے لیے غور و تامل کا وسیلہ بنتی ہے۔ اس مناسبت سے ارسطو کے مدرسہ کا نام پری پاتوس (Periptetic) مشہور ہوا۔ پری پاتوس (Peripatos) کے معنی چہل قدمی کے ہیں۔ عربی میں اس کا ترجمہ "مشائین" ہے۔ اس کے مقابلے میں افلاطونیوں کو "اشراقین" کہتے ہیں۔ مشائین منطقی تھے اور اشراقین تخیل و ادب و شعر اور ریاضیات کے دلدادہ تھے مگر دونوں کا مقصود ایک ہی تھا۔

افلاطونی مدرسہ میں ریاضیات اور فلسفہ عملی و نظری اہم شمار ہوتے تھے اور ارسطو کے مدرسہ میں طبیعات و زندگی شناسی (Biology) کو اہمیت حاصل تھی۔

افلاطون کے افکار کی بنیاد علم ریاضی اور تفکر محض تھا، کیونکہ اس کو اسکندر جیسا مربی حاصل نہ تھا۔ لیکن ارسطو کو اسکندر کے ذریعہ یورپ ایشیاء اور افریقہ سے متواتر نباتات حیوانات اور کتب دستیاب ہوتی تھیں۔ اسکندر نے اپنے میر شکار، میر باغبانی اور میر ماہی گیری وغیرہ کو حکم دے رکھا تھا کہ جہاں کہیں کوئی نباتات یا نیا حیوان ملے استاد کو بھیج دیں۔ اسی طرح اسے مصر، شام، ایران وغیرہ کے خزائن اور کتب خانوں سے جو کچھ ہاتھ آتا تھا۔ مقدونیہ میں بھیج دیتا تھا۔ اگرچہ استاد اس قابل تھا کہ ایسی کتب سے استفادہ کرے، لیکن ان کتب کی زبانیں مختلف تھیں۔ معلوم نہیں کہ ارسطو مختلف زبانیں جانتا تھا، یا لوگ اسے ترجمہ کر کے دیتے تھے۔

اس کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسکندر کی بھیجی ہوئی مختلف نباتات اور حیوانات سے استفادہ کیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے مدرسہ میں مختلف ممالک کی نباتات اور غیر ممالک کے حیوانات اس کثرت سے جمع تھے کہ مدرسہ عجائب گھر اور چڑیا گھر معلوم ہوتا تھا۔ یہی اسباب اس کے فلسفہ کی اساس تھے۔

ارسطو اور افلاطون کی بنائے فکر جدا جدا تھی۔ اسی لیے ان کے نظریوں میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔ افلاطون اپنے فکر کی قوت سے چیزوں کو سمجھتا تھا اور ارسطو دیکھ کر سوچتا تھا۔ افلاطون تخیل پسند تھا۔ اصول علم ریاضی و منطق اس کے مخصوصات تھے، کیونکہ ان کے سوا چارہ نہ تھا۔ لیکن ارسطو نے زندگی شناسی، منطق، مابعد الطبیعات پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی۔

کہتے ہیں ارسطو نے ایک ہزار کے قریب تصانیف چھوڑیں، جو نو دس سال کے عرصہ میں ناممکن معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اس کے شاگردوں نے اپنی تصانیف کو ارسطو کی تصانیف مشہور کر دیا ہو۔ ذیل کے رسائل اس کی تصنیفات میں سے مشہور ہیں۔

- المقولات (Categories) منطق میں۔
- العبارہ (Hermeneutic)
- القیاس (Analytic)
- البرہان (Apodeictic)
- الجدل (Topies)
- المغالیط (Sophistici Elenchi)
- الخطابہ (Rhetoric)
- الشعر (Poetic)
- الکون والفساد (Meteorology)
- الآثار الاولیہ (Deanima)
- النفس (De Sensu)
- الحس والمحسوس (Sense and Sensibles)
- الحیوان (Historia Animalium)
- مابعد الطبیعہ (Metaphysics)
- الاخلاق (Ethics)

ارسطو کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے علمی اصطلاحات وضع کیں جواب

تک قائم ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ موجود منطق کا موجد ہے جو آج بھی یورپ اور اسلامی ممالک میں پڑھایا جاتا ہے۔ علمائے یورپ نے اس کی منطق کو ترقی دے کر مکمل کر دیا۔

ارسطو کا اصل موضوع طبیعات اور بیالوجی ہے، جس میں وہ اپنے پیش رؤں سے بہت آگے ہے۔ ستارہ شناسی میں اس کا مرتبہ دوسرے علماء سے بلند نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس سامان نہ تھا، یا اسے نباتات وحیوانات کے مطالعہ سے ہی فرصت نہیں ملی۔

فیثاغورث آفتاب کو مرکز عالم قرار دیتا تھا، لیکن ارسطو نے زمین کو مرکز قرار دیا۔ وہ سیاسی زندگی کا بزرگ ترین محقق ہے حتیٰ کہ ہندوستان بھی اس کی نظیر پیدا نہ کر سکا۔ اس نے اپنے نکات بیان کیے ہیں، جو ہندوستان کے عقلاء کے عقیدہ وعمل سے کامل موافقت رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ خوراک عام طور پر اپنے کھانے والے کی زندگی کا راستہ معین کرتی ہے۔ ہندوستان کے عقلاء نے ہر طبقہ کے لیے خوراک معین کی ہوئی ہے، بلکہ خوراک کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے، یعنی برہمن گوشت اور حیوانی خوراک سے پرہیز کرے، کیونکہ یہ اس کی زندگی کے مطابق نہیں ہے۔ فوجی کھا سکتا ہے تاکہ اس میں قوت حیوانی اور قہرمانی بڑھے۔ پست طبقہ کے لیے کسی خوراک کی کوئی قید نہ تھی۔

ارسطو کی مابعد الطبیعہ بھی اس کی زندگی شناسی کے تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حرکت دینے والا کسی محرک کو چاہتا ہے، جو اس کی حرکت کی علت ہو اور ہر علت ایک منزل پر معلول بن جاتی ہے۔

افلاطون کے ہاں معقولات اصل ہیں اور محسوسات ان کا پرتو، جو مستقل وجود کے اہل نہیں۔ لیکن ارسطو انہیں قریب تر لے آیا ہے اور اس نے مادہ وقوت کے عنوان سے اس کی شرح کی ہے۔ اس کے عقیدہ کے مطابق ایک قوت حقیقی ہے اور اس سے جو کچھ ظہور میں آتا ہے، مادہ ہے اور مادہ بھی حقیقی ہے۔ ہر عرض اپنی باری پر جوہر بن جاتا ہے، مثلاً، جوانی، بچپن کی طاقت ہے۔ جو جوانی کی نسبت مادہ ہے۔ یعنی عالم طفولیت کے ارتقاء نے مرد کی صورت پائی اور بچے کا ارتقاء نطفے سے اور نطفہ ایک کمزور اور نامعلوم شے ہے۔ اسی طرح اگر ہم سلسلہ قوت اور مادہ کا کھوج لگانا چاہیں تو معلوم ہوگا کہ مادہ،

قوت محض اور اگر اس سے بھی آگے بڑھیں، تو بڑھاپا اور موت ہے، پھر کئی حالتوں کے بعد مادہ قوت بن جاتا ہے۔ پس زندگی ایک حرکت ہے، جو ایک لمبے خط سے ظاہر ہوتی ہے اور منفی سے مثبت کی طرف منتہی ہوتی ہے اور آغاز سے انجام کو پہنچتی ہے۔ اس دوران میں مادہ بے شمار حالتیں بدلتا ہے۔ بقول مولانا روم ''ہفتصد و ہفتاد قالب دیدہ ام۔'' مادہ کی صورت دہندہ قوت ہے۔ اگرچہ یہ قوت باطن میں ہے لیکن اس کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے اور اشیاء کو مختلف اشکال میں تبدیل کرتی ہے حتیٰ کہ وہ صورت عطا کرتی ہے، جو مقصود ہے اور یہی صورت تکمیل صورت ہے۔ اس کی تکمیل تک جو نواقص دکھائی دیتے ہیں، وہ مادہ کی ناموزونیت کا باعث ہیں۔

خدا کے متعلق ارسطو کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ایک قوت مقناطیسی ہے، جو تمام اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے، لیکن درحقیقت نہ وہ خالق ہے اور نہ خلق و خلقت سے اسے کوئی تعلق ہے۔ کشش کا باعث صرف یہ ہے کہ تمام اشیاء اس کی عاشق ہیں ۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست

مے کشد آنجا کہ خاطر خواہ اوست

حرکت درحقیقت نتیجہ کشش ہے، جو زندگی کا اظہار ہے۔ پس حرکت خدائی کشش کا نتیجہ ہے۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ خدا زندگی کی علت ہے۔ یہ عقیدہ مذاہب یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں سے مختلف ہے، کیونکہ یہ مذاہب خلقت کی تخلیق خدا کے حکم سے مانتے ہیں۔

ارسطو کا خدا بے نیاز ہے۔ اپنی نمود کا نیازمند نہیں۔ نہ کسی کو دوزخ میں ڈالتا ہے نہ بہشت میں بھیجتا ہے، نہ اسے نیکی سے تعلق ہے نہ برائی سے۔ وہ صرف قوت اور مادہ کا قائل ہے، جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔

جان جسم کی قوت ہے، جس نے اسے یہ صورت دی۔ اگرچہ جان جوہر بے مثل ہے۔ لیکن جسم کی ساخت کے مطابق اس سے افعال سرزد ہوتے ہیں مثلاً نباتات میں قوت بالیدگی ہے اور وہ غذا کی محتاج ہے۔ لیکن جب عالم نباتی کی تکمیل ہو جاتی ہے، تو وہ بالیدگی کے باعث عالم حیوانی میں داخل ہو جاتی ہے، جہاں اسے حرکت و حس عطا ہو

جاتی ہے اور جب عالم بشریت میں داخل ہوتی ہے تو نفس اور عقل سے بہرہ یاب ہوتی ہے اور حواس پنجگانہ حیوانات کی نسبت زیادہ کامل ہو جاتے ہیں۔ حس مشترک قوت ممیزہ کو تقویت دیتی ہے۔ محسوسات کے اثر کو یاد رکھتی ہے۔ رفع نواقص اور تکمیل خلقت کی آرزو جو تمام مخلوق میں حس کے بغیر موجود ہے، انسان میں ظاہر ہو جاتی ہے اور اسے بے قرار کر دیتی ہے۔ نفس انسانی جو مدبر بدن اور محسوسات کا حس کنندہ اور محسوسات کے اثر کا نگہبان ہے، موت سے فنا ہو جاتا ہے، لیکن اس کا جوہر جسے عقل یا فکر کہتے ہیں فنا نہیں ہوتا۔

ارسطو کے اخلاق کی بنیاد خوش بختی اور مسرت پر ہے۔ وہ خواہشات نفسانی کی تکمیل کی مسرتوں کو بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ انسان شرف و اختصاص قوت عقل وفکر میں ہے۔ جس قدر قوت عقل وفکر کامل ہو گی، اتنی ہی خوش بختی اور مسرت حاصل ہو گی اس لیے خوش بختی برتری فکر کا نام ہے۔

فکر صحیح انسان کے ذہن کو روشن اور نفس کو اس کا مطیع کرتا ہے جس سے خواہشات موزوں اور متناسب ہوتی ہیں اور وہ میانہ روی اختیار کرتا ہے۔ اس ترتیب سے خیر جسے سقراط عقل اور افلاطون ہم آہنگی کہتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک میانہ روی یا اعتدال ہے۔

قرآن نے بھی میانہ روی کی تعریف بایں الفاظ کی ہے:

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا و کان بین ذالک قواما.

تہور اعتدال سے دور ہوتا ہے اور اسی طرح بزدلی، لیکن شجاعت میانہ روی ہے۔

اخلاق اعتدال ریاضی سے وابستہ نہیں، کیونکہ یہ ماحول، استعداد اور عقل سے متعلق ہے۔

سیاست کے متعلق کہتا ہے، کہ انسان کو معاشرہ میں زندگی بسر کرنی چاہیے لیکن جب تک معاشرہ میں اتحاد و یگانگت نہ ہو، خوشحالی نہیں ملتی۔ اس لیے افراد معاشرہ اتحاد و یگانگت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

لوازم امور زندگی سب میں انصاف سے تقسیم ہونے چاہئیں، اگر ایسا ہو تو خواہ معاشرہ کتنا ہی محدود ہو، منظم ہو جاتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک سب سے بڑا معاشرہ جو باہم زندگی گزار سکتا ہے ایک لاکھ افراد میں محدود ہے۔

افلاطون معاشرہ میں استواری اور توانائی معاشرہ کے افراد کی آزادی اور ملکیت سے بہتر ہے، یعنی افراد کو چاہیے کہ وہ معاشرہ کے نظم و استواری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں، لیکن ارسطو نے افراد کی آزادی کو اہم بتایا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق معاشرہ کو حکومت مقننہ کے ماتحت ہونا چاہیے اور اسے حکومت کے قوانین کا احترام لازم ہے تاکہ امور حکومت منظم ہو سکیں۔ اگر اتفاقاً قوم کا کوئی فرد قہرمانہ صفات کا مالک ہو، تو اسے سردار بنایا جائے۔ اس نے حکومت کا بڑا حصہ متوسط طبقہ کے سپرد کیا ہے، جو ایک طرف سے بڑوں کے استبداد کی روک تھام کرتے ہیں اور دوسری طرف سے پست طبقہ کو خرابی پیدا کرنے نہیں دیتے۔

اس کے نزدیک معاشرہ کا بہترین نظام اس میں ہے کہ افراد معاشرہ میں اپنے قوئی فکری و جسمانی کو معاشرہ کی بہبود میں صرف کریں۔

عورت کا مقام ارسطو کی نگاہ میں مرد سے پست تر ہے۔ وہ کہتا ہے عورت، مرد کی فرمانبردار اور خادمہ ہے۔ یہ خلقی طور پر ناقص ہے اور مرد بالطبع اس پر برتری رکھتا ہے، اس لیے عورت کو خاوند کا مطیع ہونا چاہیے۔ ہاں امور خانہ داری میں آزاد ہے۔ عورت کو مردانہ صفات اختیار نہیں کرنی چاہئیں۔ مرد کا کام حکومت ہے اور عورت کا اطاعت۔ دونوں کو ایک دوسرے کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔ مرد کی شادی کی عمر ۳۷ سال اور عورت کی بیس سال مقرر کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آغاز شباب کی شادی نسل کو کمزور کرتی ہے۔ عیش و عشق سے بچ کر صحت کو بہتر بنانا چاہیے۔

ارسطو غلامی کا حامی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو آزادوں کی خدمت کرے۔ غلاموں کا فرض ہے کہ وہ کاشتکاری کریں اور آزادوں کی ضروریات فراہم کریں۔ غلاموں سے اس کی مراد یونانیوں کے جنگی قیدی اور مقبوضہ غیر اقوام ہیں۔

خاوند گھر کا بزرگ ہے۔ بیوی، بچے، اور غلام اس کے ماتحت ہیں اور یہی ایک خاندان کے افراد ہیں۔

اگر معاشرۂ ارسطو کو بالترتیب ہند و ایران مختلف طبقات میں تقسیم کریں تو اس کی تشکیل حسب ذیل ہوگی:

طبقہ اعلیٰ ☆

آزاد یونانی جو ہر لحاظ سے خوش حال، خوش اخلاق اور تحصیل علم و عقل سے آراستہ ہوں، ملک کی حفاظت کریں۔

طبقہ دوم ☆

ہنر مند و صنعت کار جو دولت مند ہوتے ہیں۔

غلام ☆

جو ہندوستانی شودروں کی طرح خدمت کرتے ہیں۔

ارسطو تجارت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا، لیکن کاشتکاری، مویشی پروری اور کانکنی کو پسند کرتا ہے اور بہت اہمیت دیتا ہے۔ سود لینا اس کے نزدیک نہایت قبیح ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ یونانیوں کو غیر یونانیوں سے جنگ کرنی چاہیے اور انہیں اپنا مطیع و فرمانبردار بنانا چاہیے۔

حکومت سے متعلق ارسطو کا نظریہ یہ ہے کہ ڈیموکریسی یعنی جمہوریت ہونی چاہیے یا ارسٹوکریسی یعنی شاہی۔ وہ کہتا ہے کہ حکومت کی خوبی اصول حکومت میں نہیں ہوتی، بلکہ ارباب حکومت کی خوبی و شائستگی میں ہے اگر حاکم درست کار ہوں تو اصول خواہ ڈیموکریسی ہوں یا ارسٹوکریسی، قوم خوش حال ہو سکتی ہے، اگر حاکم غلط کار ہوں تو ڈیموکریسی پارٹی بازی اور شاہی ظلم و ستم بن کر رہ جاتی ہے۔

دوستی کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ دوستی، ہمکاری، ہم آہنگی، محبت اور شفقت کا وسیلہ ہے۔ آج یورپ اور امریکہ میں اس اتحاد کو تہذیب و تمدن کے نام سے قائم کیا گیا ہے اور اگرچہ ان ممالک کا یہ اتحاد مصنوعی ہے، لیکن ایک نظم و ضبط کے ماتحت ہے۔ اسے نسل، قوم اور وطن پرستی سے دلکش بنایا گیا ہے، یہاں تک کہ ان اقوام کے افراد کا اس پر ایمان ہے اور اسی ایمان نے ان کو باہم متحد، دوست، ہم کار اور ہمدرد و مشفق بنا دیا ہے، بالخصوص اقوام غیر کے مقابلہ میں یہ بے حد متحد اور منظم ہیں۔

ارسطو اتحاد و مؤدت کو عدل سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ اتحاد و دوستی عدالت کی نیاز مند نہیں ہوتی۔ دو متحد اور دوست شخص آپس میں ایک جان اور دو قالب ہوتے ہیں، لہٰذا جس کے دوست زیادہ ہوتے ہیں اس کا درحقیقت کوئی بھی دوست نہیں ہوتا۔ پس ایک یا چند مخلص دوست جو ہم دل اور ہم آہنگ ہوں بہت سے دوستوں سے بہتر ہیں۔ کیونکہ زیادہ دوست، دوست نہیں بلکہ آشنا ہوتے ہیں۔ دوستی تو پائندگی کی طالب ہے۔ حقیقی دوستی دیرینہ تعلقات و محبت سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ تکالیف سے حاصل کی ہوئی چیز آسانی سے ضائع کرنے کو دل نہیں مانتا۔ دو دوستوں کی محبت ماں اور بچے کی محبت کی طرح ہوتی ہے۔ ماں خیال کرتی ہے کہ تکالیف جھیل کر ہی بچوں کو پالا جا سکتا ہے۔ وہ مصائب برداشت کرتی ہے مگر بچوں کو جدا نہیں کرتی۔

ارسطو نے طریق تربیت اس طرح بیان کیا ہے۔

1- پہلے پانچ سال کھیل کود اور ورزش میں۔

2- پانچ سے سات سال تک ابتدائی تعلیم جو بچے کے لیے آسان ہو۔

3- سات سے چودہ سال تک موسیقی اور ورزش کی ابتدائی تعلیم۔

4- چودہ سے اکیس سال تک موسیقی ادب اور نقاشی کی متوسط تعلیم۔ اس کے بعد بچہ علوم میں داخل ہو جاتا ہے اور جس کو پسند کرتا ہے حاصل کرتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک تزکیہ اخلاق کے بغیر تحصیل علوم بے نتیجہ ہے۔ اس لحاظ سے تدریس کے دوران میں شاگردوں کے اخلاق کو شائستہ بنانا چاہیے اور انہیں ضبط میں لا کر پابندیٔ قوانین کو ان کی طبیعت ثانیہ بنانا چاہیے۔

انسان کامل کے متعلق ارسطو لکھتا ہے۔ عقل مند انسان اپنے آپ کو بے ہودہ خطرات میں نہیں ڈالتا۔ لیکن جب وہ آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے، تو صبر کرتا ہے اور استقلال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ حتیٰ کہ کامیاب ہو جاتا ہے یا اپنی جان دے دیتا ہے۔ وہ خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اسے یہ خواہش نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے لیے زحمت کش ہوں اور وہ آسودہ ہو۔ وہ محسن ہے کیونکہ وہ احسان کا احساس رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ احسان سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ احسان کا بدلہ لینے کو حقیر جانتا ہے۔ ریا

کاری اسے ناپسند ہے۔ جس چیز کو پسند کرتا ہے اسے تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھتا کیونکہ وہ تعجب اور حیرت کو کوئی شائستہ اور بڑی چیز نہیں سمجھتا اور سب کو موقع و بے موقع خوش کرنے کو مذموم جانتا ہے، مگر اس صورت میں کہ خوش کرنا ہی شائستگی ہو۔ تکلیف سے دل میں کینہ نہیں رکھ لیتا، بلکہ چشم پوشی کرتا ہے اور کسی کے برا بھلا کہنے سے پست ہمت نہیں ہوتا۔ بدگوئی نہیں کرتا۔ جب کسی سے بات کرتا ہے تو اس کا مقصد اظہار حقیقت ہوتا ہے۔ وہ باوقار ہے۔ اس کی آواز مدہم اور باتیں سنجیدہ اور متین ہوتی ہیں۔ جلد باز نہیں ہوتا اور ہر چیز سے رغبت نہیں رکھتا بلکہ بہت سی اشیاء میں سے ایک کو پسند کرتا ہے اور اسے اچھی طرح دیکھتا ہے۔ افراط و تفریط سے بیزار ہوتا ہے اور کسی چیز کو نہ تو بے حد اہم تصور کرتا ہے اور نہ بے اعتنا رہتا ہے۔ وہ صدمات میں صابر ہوتا ہے اور امکان بھر ہر حالت کو اپنے موافق بناتا ہے۔ تنہائی میں اپنا بہترین دوست ہوتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس کے افکار منظم ہو رہے ہیں کیونکہ بے استعداد و ناشائستہ آدمی اپنا آپ دشمن ہوتا ہے اور تنہائی سے ڈرتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ کارکنان حکومت ہی افراد معاشرہ کی تربیت کے ضامن ہیں۔ انہیں سب سے پہلے اطاعت اور نظم سیکھنا چاہیے کیونکہ جو اطاعت نہیں جانتا، وہ اچھا حاکم نہیں ہوسکتا۔ جب انسان کامل ہو جاتا ہے، تو وہ اشرف المخلوقات بنتا ہے اور اگر بے تربیت رہے، تو ارذل المخلوقات ہے۔ انسان نطق کے باعث حیوان سے متمیز ہو جاتا ہے اور معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے اور معاشرہ کے توسط سے عقل و ہنر کو کمال پر پہنچاتا ہے اور عقل و ہنر کے وسیلے سے نظم کو محبوب جانتا ہے۔ نظم سے دانائی حاصل کرتا ہے اور دانائی اسے شائستہ بنا دیتی ہے۔ انسان تنہائی میں زندگی نہیں گزار سکتا، مگر اس صورت میں کہ حیوان بن جائے یا دیوتائی حاصل کر لے۔

ارسطو کے آخری ایام پریشانی کے دن تھے۔ جب اسکندر بادشاہ تھا، اس کی خدمت کرتا تھا۔ اسی دوران اس سے ایک حرکت سرزد ہوئی، جو استاد کی رنجش کا باعث بنی۔ ارسطو کا ایک بھتیجا تھا، کالس تھینس (Callishtnenes) جو اسکندر کے ساتھ ایشیاء میں کسی خدمت پر مامور تھا۔ اسے اسکندر نے قتل کرا دیا۔ خیال ہے کہ اس واقعہ کے

بعد استاد شاگرد میں مخلصانہ ارتباط نہ رہا تھا، لیکن لوگوں میں مشہور تھا کہ ارسطو، اسکندر کا استاد اور خیر خواہ ہے۔ اس کی تعریف کرتا ہے اور اس کے کاموں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن ارسطو کے برعکس اکثر یونانی اسکندر کے مخالف اور آزادی کے طالب تھے اور ارسطو کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ اسکندر مر گیا اور ارسطو کی زندگی اپنے ہم وطنوں میں خطرناک ہوگئی۔ لوگ اسے قتل کرنے کے درپے ہوگئے اور آخر کار وہ ایتھنز چلا گیا اور خالکس (Chalcis) میں جا پہنچا جہاں بیمار ہو کر تنہائی اور کس مپرسی کی حالت میں (۳۲۲) ق۔م میں موت سے ہم آغوش ہوگیا۔ اسی سال دیموستھینس (Demosthenes) یونان کے بہترین مقرر اور اسکندریہ کے دشمن نے بھی وفات پائی۔ گویا ایک ہی سال میں ایک بڑے شہنشاہ، ایک بڑے مقرر اور ایک بڑے فلسفی سے دنیا خالی ہوگئی۔

ارسطو کی تصنیفات یورپ اور ایشیاء میں اتنی اہمیت کی حامل ہیں کہ کتب مذہبی کے بعد انہیں سب سے زیادہ مرتبہ حاصل ہے اور خود ارسطو معلم اول کے نام سے موسوم ہے۔

ارسطو کے بعد

جب اسکندر نے ایک دنیا کو تسخیر کرلیا، تو اسے دو چیزوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلی یہ تھی کہ یونانی اس کی غیر موجودگی میں اطاعت سے منحرف نہ ہو جائیں۔ دوسری یہ تھی کہ اگرچہ مغرب اور ایشیاء کی اقوام نے شکست کھائی ہے، مگر حقیقی طور پر مطیع نہیں ہوئیں اور ممکن ہے کہ دوبارہ بغاوت کر دیں۔ اس لیے اسکندر چاہتا تھا کہ ''بہ یک کرشمہ دوکار'' کے مصداق یونانیوں کو دولت کے لالچ سے اپنے وطن سے نکال کر ایشیائے کوچک، ایران اور ہندوستان میں آباد کرے، تاکہ وہ خوش حال ہو جائیں اور یونان میں بغاوت کا خطرہ نہ رہے اور ضرورت کے وقت ایران اور دوسرے ممالک میں ان سے مدد لی جاسکے۔ اس نے اپنی اس تجویز کو جامۂ عمل پہنایا۔ درحقیقت اس کا یہ خیال نہایت درست تھا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ یونانیوں کے اس انتشار سے یونان کی تہذیب و حکمت بھی منتشر ہوگئی۔ خصوصاً جب اسکندر کی وفات کے بعد ایشیائے کوچک، ایران اور دیگر ممالک میں طوائف الملوکی پیدا ہوئی تو ان میں سے ہر ایک کا خیال تھا کہ اس کا دربار زیادہ آراستہ ہو اور علوم وفنون کا مرکز بن جائے، جیسا کہ خلافت بنوعباس کے زوال اور دیگر اسلامی حکومتوں میں طوائف الملوکی کے ساتھ ہوا، جن میں سے سامانی، غزنوی، طاہری، صفاری اور دیلمی تھے، جو صرف ایران میں ظاہر ہوئے۔ ان خاندانوں کے حکمرانوں کی آپس میں چشمک تھی اور ہر ایک دوسروں سے اپنے دربار کو زیادہ پرشکوہ اور آراستہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اپنے ذوق کے مطابق ادباء و فضلاء اور شعراء کو جمع کرتا تھا۔

سامانی مدعی تھے کہ وہ بہرام چوبین کی نسل سے ہیں، اس لئے وہ تورانیوں سے برسرِ پرخاش تھے۔ جنگی افسانوں بالخصوص ایران و توران کے جنگ ناموں کو پسند کرتے تھے۔ اسی لیے ہر شاعر و افسانہ گو ایسے افسانے تلاش کرتا تھا۔

سلطان محمود غزنوی سامانیوں کی پیروی اور جہانگیری کے خیال سے کیخسرو ثانی بننا

چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ شاہنامہ جیسی کتاب تیار کرائے اور عوام میں اسے پھیلائے نیز ہندوستان کو فتح کرے اور اس کا دربار ایران میں اپنی نظیر آپ ہو۔

مشہور ہے کہ اس کے دربار میں شعراء وفضلاء کی تعداد چار سو تھی۔ جہاں کہیں کسی مشہور فاضل کی سن گن پاتا تھا، اسے اپنے دربار میں بلا لیتا تھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ شیخ الرئیس بوعلی سینا اور چند دوسرے فاضل اشخاص کو بزور دربار میں رکھنا چاہتا تھا۔

دیلمی بغداد کے قریب تھے۔ لہٰذا وہ عربی ادب وشعر کے مربی بنے۔ طاہری اپنے آپ کو عربی النسل کہتے تھے۔ انہوں نے فارسی کتب نابود کرا دیں۔ صفاریہ کو ایرانی تعصب حاصل تھا۔ انہوں نے فارسی کو رواج دیا۔ ہر ایک، ایک الگ جنون کا مجنون تھا اس لیے یہ تصور کرنا پڑتا ہے کہ شام، آرمینیا، مصر، باختر اور پنجاب وغیرہ کے بادشاہ بھی اس جنون سے خالی نہ تھے۔ لہٰذا ایتھنز کا ادب وحکومت یونان سے آ کر مختلف ممالک میں مرکز پذیر ہوا اور یونانی ادب وفلسفہ ملکی ادب وفلسفہ سے ممزوج ہو گیا۔ مثلاً باختر میں ادب یونان کے ساتھ یونانی، ہندی اور ایرانی دیوتا بھی شریک ہو گئے اور یہی دیگر ممالک کا حال تھا۔

ہم عصر حکماء وادباء کو طوائف الملوکی سے سروکار نہ تھا۔ وہ فلسفہ قدیم کو مفصل و مشروح کرتے تھے۔ جزئیات میں امتیازات پیدا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مشرق ومغرب کے اتصال سے اسے افکار بھی آپس میں متصل ہو گئے اور روم پایہ تخت اٹلی بھی ایک مرکز بن گیا۔ تازہ افکار کی بجائے افکار قدماء کی تشریح ہونے لگی۔ ان میں سے اپیکورس خلفائے اسکندر کا ہم عصر تھا، جو ۳۴۱ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۲۸۰ ق۔م میں مرا۔ اس کا فلسفہ ڈیمو کریٹس (Democritus) کے فلسفہ کا اعتدال ہے۔

اپیکورس کے فلسفہ کی بنیاد یہ ہے کہ انسان جب تک زندہ ہے اسے کسی نہ کسی چیز کی خواہش ہے اور اس چیز کا حصول اس کی مسرت کا موجب ہے۔ لہٰذا زندگی اور اس کے اعمال کی اساس فقط مسرت ہے، جس کا ترک ناممکن ہے۔ البتہ مسرت کی کئی قسمیں ہیں، لیکن عقلمند ان میں سے بہترین کو انتخاب کرتا ہے۔ لذائذ مثلاً کھانا، پینا، سامان راحت، مکان، لباس، شہوت رانی اور حکومت وغیرہ مسرتیں ضرور ہیں، لیکن بسا اوقات

ان کا خاتمہ رنج وغم اور دردسر کا موجب ہوتا ہے صرف عقل ہی مسرت کا بہترین وسیلہ ہے۔ اسے جس قدر زیادہ حاصل کرو اسی قدر زیادہ مسرت حاصل ہوگی۔ جہاں تلخی پیدا ہو، وہاں بھی امن وسکون کی دولت اپنا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

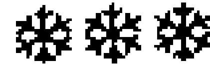
اپیکورس کا مدرسہ اس کے اپنے ایک باغ میں تھا، جہاں وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ہم آہنگی، محبت اوراخلاص سے زندگی گزارتا تھا۔ اس کے معاصرین میں سے زینو (Zeno) خاص طور پر مشہور ہے۔ جو جزیرہ قبرص میں (۳۳۶-۲۶۴) ق۔م تک زندہ رہا۔

یہ فلاسفر ایک اصول کا بانی ہے۔ اس کے پیرو رواقین کے نام سے مشہور تھے۔ زینو کا فلسفہ اپاتھیا (Apathia) یا دنیا سے بے اعتنائی اور بے تعلقی ہے۔ اس کے عقیدے کے مطابق عقل کے ذرائع وہم سے پیدا ہوئے اور گمان وادراک تک پہنچ کر عقل پر منتج ہوئے۔ مذکورہ مراتب محسوسات کی حدود کے اندر ہیں۔ اسی لیے انسان مجبور ہے کہ حواس اور عقل کے وسیلہ سے اشیاء کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرے۔ اس صورت میں منطق ایک بڑا ذریعہ ہے۔ رواقین کا تکیہ اسی علم پر ہے۔ وہ ہندوؤں کی طرح ادوار زمانہ کا بھی قائل تھا۔ اس کے نزدیک ہر دور آغاز ہوکر ایک معین زمانہ کے بعد ختم ہو جاتا ہے اور پھر نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ ہر دور کی خصوصیات ہیں۔

اس کے نزدیک دنیا قابل اعتناء ودلبستگی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو مجبور و عاجز تصور کرتا تھا اور کہتا تھا کہ انسان طبیعت کے باعث ناچار و مجبور ہے۔ اس لیے آرزوؤں کو وسعت دینے کی بجائے انہیں محدود کرنا چاہیے، تاکہ دلی سکون میسر ہو اور دلی اطمینان درحقیقت انسانی سعادت ہے۔ اعمال عقل کے ماتحت ہونے چاہئیں۔ اس کے زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہوا، جنہیں اسکپٹک (Skeptics) یا متشکک کہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حقیقی عقل انسان کو میسر ہی نہیں۔ جو کچھ یہ جانتا ہے، حقیقت و غیر حقیقت کے درمیان ہے، یعنی ممکن ہے کہ درست ہو اور ممکن ہے کہ غلط ہو۔ یہ عقیدہ بعد میں بعض عیسائی اور اسلامی متکلمین میں پیدا ہوا تھا۔

فلاسفہ یونان میں سے کوئی فلسفی افلاطون اور ارسطو کی شہرت کو نہیں پہنچا۔ ان کا

فلسفہ زیادہ تر اخلاق تھا۔ وہ جو کچھ کہتے تھے، یونانی حکماء کی تقلید تھی اور اس پر اپنے سلیقہ سے اضافہ بھی کرتے تھے۔ انہیں میں سے سنیکا قیصر نیرو اور لوکریسوس، سسرون، ایکتیتوس، قیصر مارکوس اور لیوس وغیرہ تھے، لیکن انہوں نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا حتی کہ مشرق و مغرب کے افکار کی اسکندریہ میں آمیزش سے فلسفہ نو افلاطونی پیدا ہوا۔



افلاطونیّتِ جدیدہ

اسکندریہ (مصر) میں مشرق ومغرب کے افکار کے امتزاج نے جہاں عوام کو متاثر کیا، وہاں سب سے پہلے ان سے عیسائیت اثر پذیر ہوئی اور پھر مسلمان بھی اس کے تاثر سے نہ بچ سکے۔ افلاطونیت جدیدہ کا مختصر ماحصل یہ ہے:

وجود یگانہ ہے۔ یہ عالم دیگر عوالم کے واسطہ سے اس سے نکلا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔ حقیقت یگانہ تمام خوبیوں سے برتر، حیات سے برتر، افکار سے برتر، غیر متحرک اور موجودات کی علت حقیقی ہے۔ وہ جیسی بھی ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی، کیونکہ وہ عقل وادراک سے برتر ہے، لیکن اس کے فیض کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اس کا پہلا فیض جو کامل بھی ہے اور جاوید بھی، عقل کل ہے۔ عالم ناپدید ہے اور اس کی تصویر نفس کل ہے عقل کل نفس پر پرتو ڈالتی ہے اور اسے تابندہ بنا دیتی ہے۔

افلاطونیت جدیدہ ستاروں اور زمین کو بھی قابل احترام قرار دیتی ہے۔ اس کے نزدیک مادہ یا ہیولیٰ بے صورت اور غیر متحرک ہے، لیکن حیات پذیر ہے۔ جب زندگی اس پر منعکس یا محیط ہو جاتی ہے، تو متحرک دکھائی دیتا ہے، جس طرح آئینہ سے متحرک سائے گزرتے ہیں اور وہ متحرک نظر آنے لگتا ہے۔ جان کا مادہ سے تعلق اس کا تنزل ہے۔ جب جان کا ملاً مادہ سے پیوست ہو جاتی ہے، تو صعود کرتی ہے اور یہ صعود بھی تدریجی ہوتا ہے۔

انسان کے دو نفس ہیں۔ ایک الٰہی جس کی صفات حافظہ تصور وتمیز اور ارادہ ہیں۔ دوسرا حیوانی جس کی صفات خواہشیں، درد، غم، خوشی، کدورت، محبت، غضب ہیں۔ یہ نفس مادہ سے پیوست ہے۔ نفس ناطقہ بدن سے جدا اور اس پر محیط ہے۔ فیثاغورث نے جان کو توازن یا آہنگ موسیقی کہا ہے اور ارسطو نے صورت کو۔ لیکن پلوتینوس اسے حیات یا مایہ حیات کہتا ہے اور عرفانی مانتا ہے۔

نفوس الٰہی، نفس کل کا پرتو، مجرد اور پاک ہوتے ہیں اور چونکہ عالم محسوس سے ملحق

ہیں تصور یا ارادہ نیک کو نیک اعمال سے توام کر کے جلدی اصلی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور بعض عرصہ دراز تک مادہ کے جال میں گرفتار رہتے ہیں۔ جو لوگ وقتی لذتوں اور مشتہیات سے بے اعتنا ہوئے، انہیں نجات حاصل ہوگئی۔ انہیں تین مراحل ذیل طے کرنے پڑتے ہیں۔

مرحلہ اول ☆

حسن سے محبت بالخصوص حسن آواز سے۔ جب ان کے کان اور ہوش آوازوں کے توازن اور نظم سے پوری طرح آشنا ہو جاتے ہیں تو وہ دوسرے مرحلہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

مرحلہ دوم ☆

دوسرے مرحلہ میں وہ حسین اجسام سے عشق کرتے ہیں۔ جسم سے مراد ہر قسم کا جسم ہے۔ یعنی خواہ صورت جسمانی ہو یا محسوسات۔ جب ان کی آنکھیں اور ہوش حسن کے توازن اور نظم سے پوری طرح آشنا ہو جاتے ہیں، تو تیسرے مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

مرحلہ سوم ☆

اس مرحلہ میں وہ حسن کو عقل اور صداقت میں مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سے لذت پذیر ہوتے ہیں۔ جب ہر مرحلہ میں کمال حاصل کر لیتے ہیں، تو مقصود کو پا لیتے ہیں۔

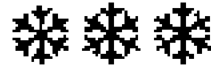
عالم روحانیت اور پاکیزگی کے بھی دو درجے ہیں۔ پہلے درجے میں سالک خدا کی تلاش کرتا ہے، لیکن اپنے آپ کو بھی فراموش نہیں کرتا۔ دوسرے درجے میں اپنے آپ کو فراموش کر کے خدا میں فانی ہو جاتا ہے۔

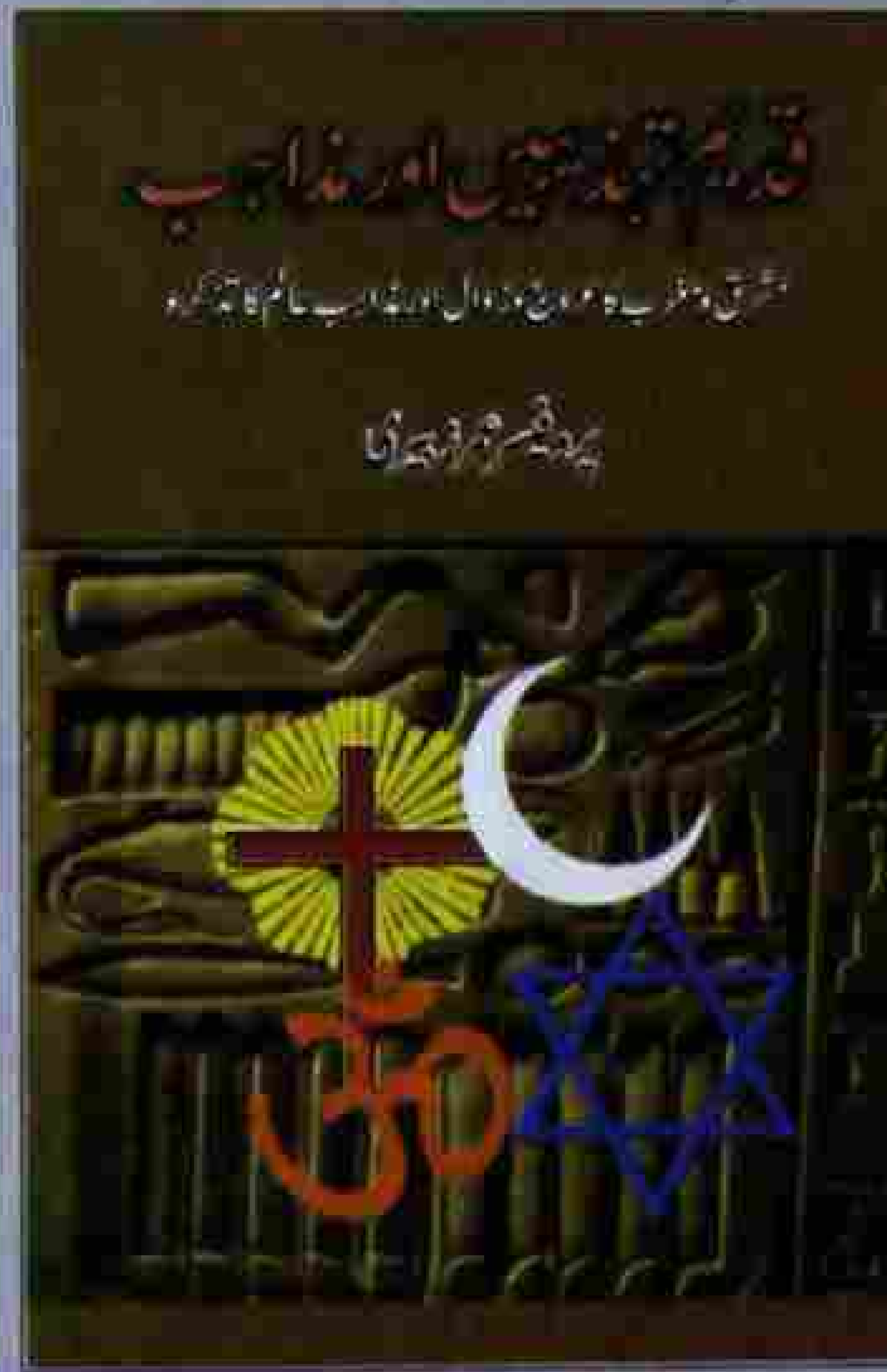
متصوفین نے یہیں سے مراحل سلوک لیے ہیں۔ جنہیں انہوں نے نئے الفاظ و اصطلاحات کا جامہ پہنا کر اپنا لیا ہے۔ متصوفین کے مراحل سہ گانہ درج ذیل ہیں۔

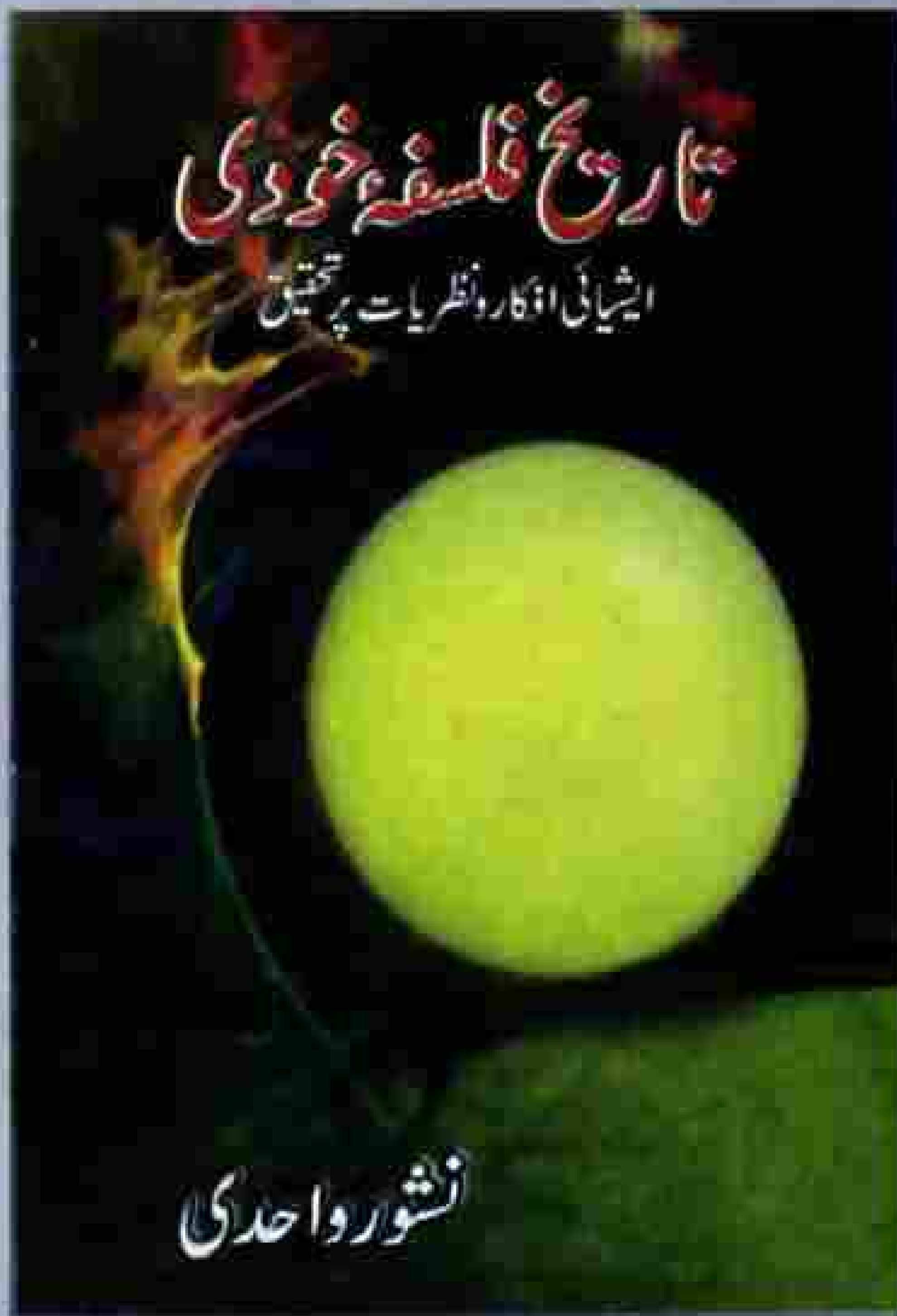
- فنا فی الشیخ۔
- فنا فی الرسول۔
- فنا فی اللہ۔

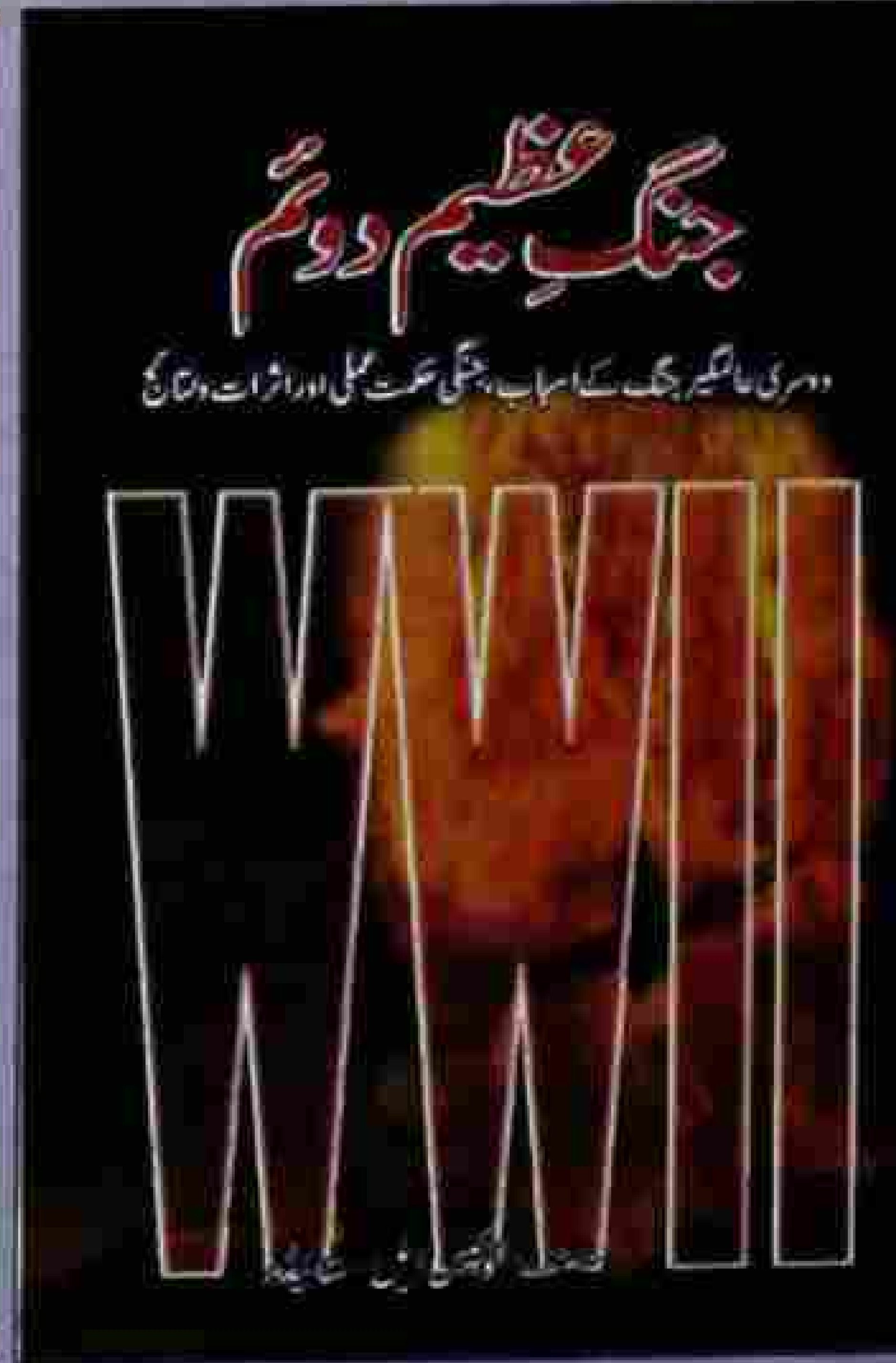
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مراحل سہ گانہ اسلامی نہیں ہیں، بلکہ افلاطونیت جدیدہ سے لے کر اسلام میں داخل کیے گئے ہیں۔

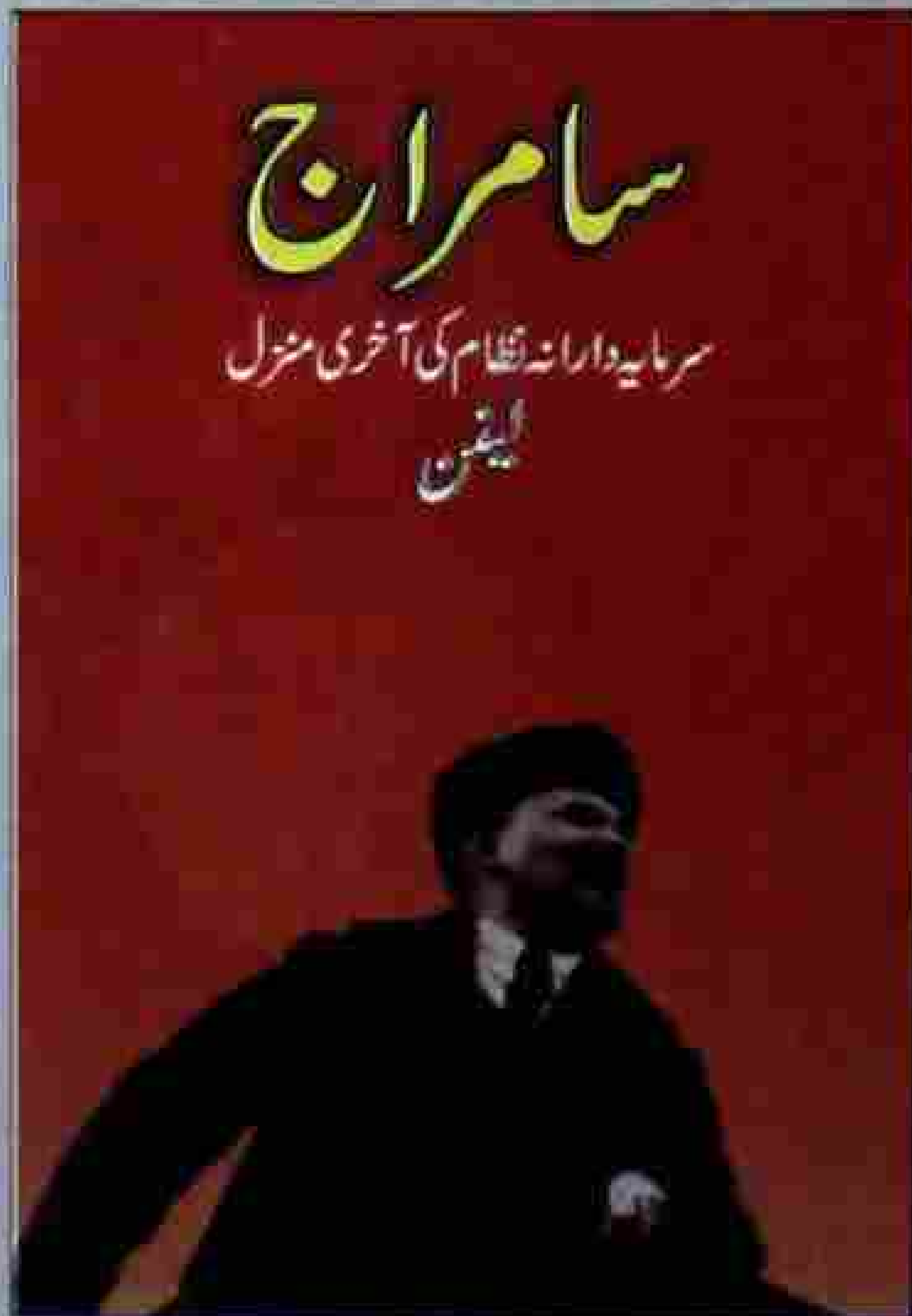
درحقیقت ہمارا تصوف افلاطونیت جدیدہ سے بہت زیادہ متاثر ہے اور یہی فلسفہ اس کا تار و پود ہے۔











Design By
0333-4349861